باسمہ تعالیٰ

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

قرآنِ مجید کے خلاف گہری سازش

جو ہماری تباہیوں کا بنیادی سبب ہے

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہ

قرآن مجید کے خلاف گہری سازش

قرآنِ مجید میں ہے: رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی۔ (۲۰/۵۰)۔ ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شے کی تخلیق کی اور پھر اس کی راہ نمائی اس منزل کی طرف کر دی جو اس کی خلقت کا منتہیٰ ہے۔ دوسری جگہ اس کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی کہ: اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی۔ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی۔ (۸۷/۲-۳) اس نے ہر شے کو پیدا کیا۔ پھر اسے حشو و زوائد سے پاک کر کے، اس میں اعتدال پیدا کیا۔ پھر اس کے لئے ایسے قوانین و ضوابط مقرر کر دیئے جن کے اتباع سے وہ اپنی تخلیقی منزل (DESTINATION) تک پہنچ سکے۔ یعنی اس منزل تک اس کی راہ نمائی خدا کے مقرر کردہ قوانین کی رو سے ہوتی ہے۔ ان (اور ان جیسی متعدد دیگر) آیات سے واضح ہے کہ اشیائے کائنات کو (جن میں انسان بھی شامل ہیں،) راہ نمائی عطا کرنا، خدا نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ اشیائے کائنات میں یہ راہ نمائی ہر شے کے اندر ودیعت کر دی گئی۔ اسے جبلت یا (INSTINCT) کہتے ہیں۔ جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے، یہ راہ نمائی اس وحی کی رو سے عطا کی گئی جو حضرات انبیاءِ کرام کی وساطت سے انسانوں تک پہنچائی گئی۔ اس وحی کی ابتدا حضرت نوح علیہ السلام سے ہوئی اور اس کی تکمیل حضور خاتم النبیین (صلے اللہ علیہ وسلم) کی طرف نازل کردہ کتاب (قرآنِ مجید) میں۔ اس کتاب میں دی گئی وحی کے متعلق فرمایا کہ: وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا۔ خدا نے انسانی راہ نمائی کے لئے جو قوانین دینے تھے وہ اس کتاب میں تکمیل تک پہنچ گئے۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ۔ (۶/۱۱۶) اب ان میں نہ تو کسی حک و اضافہ کی ضرورت ہوگی اور نہ ہی کسی تبدیلی کی حاجت۔ مکمل اور غیر متبدل ضابطۂ قوانینِ خداوندی۔ چونکہ اس ضابطہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، اور تمام نوعِ انسان کے لئے سرچشمۂ ہدایت قرار دیا گیا تھا اس لئے اس کی حفاظت کا ذمہ بھی خدا نے خود اپنے اوپر لے لیا..... فرمایا کہ: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ (۱۵/۹) یقیناً ہم ہی نے اس ضابطۂ قوانین کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

یہ ہے قرآنِ کریم کی پوزیشن ——— تمام نوعِ انسان کے لئے، خدا کی طرف سے آخری۔ مکمل۔ غیر متبدل۔ محفوظ ضابطۂ ہدایت۔

قرآنِ کریم میں عطا کردہ راہ نمائی، انسان کی پوری زندگی اور اس کے ہر گوشے کو محیط ہے لیکن اگر ہم اس کی اصل و اساس کو چند الفاظ میں سمٹا کر بیان کرنا چاہیں، تو اس کے لئے ایک تمہیدی حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہوگا۔

انسانوں کے دو طبقے

اور وہ تمہیدی حقیقت یہ ہے کہ یوں تو دنیا میں ایک فرد دوسرے فرد سے الگ۔ ایک نسل دوسری نسل سے جدا، اور ایک قوم دوسری قوم سے مختلف نظر آتی ہے لیکن اگر نوعِ انسان کی تاریخ پر گہری نگاہ ڈالی جائے تو شروع سے آج تک انسانیت دو ہی طبقوں میں بٹی ہوئی ملے گی۔ ایک طبقہ وہ جو محنت اور مشقت کرکے کماتا ہے اور دوسرا وہ جو اُن کی محنت کے ماحصل کو غصب کرکے لے جاتا، اور مفت میں عیش کی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس تفریق سے باہمی مفادات میں ٹکراؤ ہوتا ہے اور اس ٹکراؤ کا نتیجہ فساد انگیزی اور خوں ریزی ——— خواہ یہ افراد میں ہو۔ گروہوں میں ہو یا قوموں میں۔ یہی نوعِ انسان کی بنیادی (PROBLEM) ہے، اور خدا کی وحی اس پرابلم کا حل بتاتی ہے۔ اس وحی کی رُو سے ایسا نظام یا ایسا معاشرہ قائم ہوتا ہے جس کے اساسی اصول یہ ہیں کہ: لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ (۵۳/۳۹)۔ محنت کے بغیر کسی کو کچھ نہیں مل سکے گا۔ اور فَلَا یَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا۔ (۲۰/۱۱۲) اور محنت کرنے والے کو نہ کسی قسم کی بے انصافی اور دھاندلی کا ڈر ہوگا اور نہ ہی اس کی محنت کے ماحصل کو کوئی ہضم کر سکے گا۔ قرآنِ کریم نے اسی پروگرام کو پیش کیا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے علامہ اقبالؒ نے اپنے مخصوص انداز میں ان دو مصرعوں میں سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ جب کہا کہ :؎

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ (جاوید نامہ)

قرآن کیا ہے؟ ہر قسم کے استحصال کرنے والوں (EXPLOITERS) کے لئے موت کا پیغام۔ اور ہر مظلوم، بیکس اور بےبس کا حامی اور مددگار! ——— اب ظاہر ہے کہ مفاد پرستوں کا ہر گروہ اس قسم کے انقلاب آفریں نظام کی شدت سے مخالفت کرے گا اور اپنا پورا زور لگا دے گا کہ وہ کامیاب نہ ہونے پائے۔ حضورؐ نبی اکرمؐ کے پیش کردہ نظام کی جس شدت سے مخالفت ہوئی اس کی تفاصیل قرآن مجید میں شرح و بسط سے مذکور ہیں۔ یہ مخالفت انفرادی تصادمات سے لے کر جنگ کے میدانوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ جب وہ لوگ ان کوششوں میں ناکام رہ گئے تو انہوں نے مفاہمت (COMPROMISE) کی کوششیں شروع کر دیں۔ مفاہمت کی شرط کیا تھی؟ یہ کہ: قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ۔ وہ کہتے تھے کہ تم اس قرآن کی جگہ کوئی اور قرآن لاؤ۔ اور اگر یہ ممکن نہیں تو اَوْ بَدِّلْهُ (۱۰/۱۵) اس میں ہماری منشاء کے مطابق تبدیلیاں کر دو۔ ان کے اس

مفاہمت ناممکن ہے

مطالبہ کا جواب کیا تھا؟ یہ کہ یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ نہ اس قرآن کی جگہ دوسرا قرآن لایا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس میں کسی قسم کی تبدیلی کی جا سکتی۔ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَیُدْهِنُوْنَ۔ (۶۸/۹) وہ نبی اکرمؐ سے کہتے کہ کچھ آپ اپنے مقام سے ہٹیں، کچھ ہم اپنے مطالبہ میں کمی کر دیتے ہیں۔ اس طرح باہمی مفاہمت ہو سکے گی۔ اور اس کا جواب یہ تھا کہ اپنے مقام سے باطل ہٹا کرتا ہے۔ حق نہیں۔ اسی لئے حق اور باطل میں مفاہمت ہو ہی نہیں سکتی۔ حضورؐ نبی اکرمؐ کی دعوتِ توحید کی تھی جس کا عملی مفہوم تھا خالص کتاب اللہ کی اطاعت۔ لیکن وہ چاہتے تھے کہ اس میں کچھ انسانوں کے خود ساختہ قوانین بھی شامل کر لیے جائیں۔ قرآن کے الفاظ میں ذٰلِکُمْ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِیَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ کَفَرْتُمْ وَاِنْ یُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا۔ جب انہیں خدائے واحد کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو یہ اس کے قبول کرنے سے

انکار کرتے ہیں .... اور جب اس کے ساتھ انسانی قوانین ملا دیئے جائیں تو اسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (۴۰/۱۲) قانون۔ حکم۔ حکومت۔ فیصلہ صرف خدا کا ہو سکتا ہے۔ کائنات میں اقتدارِ اعلیٰ اسی کو حاصل ہے۔ اس کے ساتھ کسی اور کا حکم شامل نہیں کیا جا سکتا۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔ (۱۲/۴۰) یہی قائم رہنے والا محکم نظامِ حیات ہے۔ اس میں ذرا سا بھی ردّ و بدل نہیں ہو سکتا۔ ان سے پوچھو کہ، اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ۔ (۲۹/۵۱) یہ کتاب جسے میں پیش کر رہا ہوں، اس میں کس بات کی کمی ہے جسے پورا کرنے کے لئے تم اس میں انسانی آمیزش ضروری سمجھتے ہو۔

حضورؐ نبی اکرم نے، ان مفاد پرست گروہوں کی مخالفت، اور مفاہمت کی کوششوں کے علی الرغم قرآنِ خالص کی بنیادوں پر نظامِ خداوندی قائم کرکے دکھا دیا۔ اسی کو الدین یا الاسلام کہا جاتا ہے۔ اس سے ان مفاد پرستوں کے دل پر جو گذری ہوگی، ظاہر ہے‘ اس زمانے میں تو وہ کچھ نہ کر سکے لیکن کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے سر ابھارا۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی بتایا ہے وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ امتِ مسلمہ کا یہ نظام قرآنِ خالص کی اطاعت سے قائم ہے۔ اس لئے ان کی کوشش یہ تھی کہ قرآن اس امت کی زندگی کا ضابطہ نہ رہے۔ صدرِ اول کے بعد‘ ہماری ساری تاریخ ان مفاد پرستوں کی انہی کوششوں کی داستان ہے اور ان کوششوں میں ان کی کامیابی‘ ہمارا المیہ۔ صحبتِ امروزہ میں مَیں اس داستان کی مختصر سی جھلک آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

یوں تو مفاد پرست گروہوں کی متعدد قسمیں ہو سکتی ہیں، لیکن اصولی طور پر انہیں تین شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ حکمرانوں کا گروہ۔ نظامِ سرمایہ داری کے علمبرداروں کا طبقہ اور مذہبی پیشوائیت۔ قرآنِ کریم نے فرعون۔ قارون اور ہامان کے حوالے سے انہی کا تعارف کرایا ہے۔ اُمت کی نگاہوں سے قرآنِ خالص کو اوجھل کرنے کے لئے‘ حکمران اور سرمایہ پرست طبقہ، براہ راست کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس فریضہ کو مذہبی پیشوائیت ہی سرانجام دے سکتی تھی۔ اس لئے اول الذکر دونوں گروہ ان کی پشت پناہی کرتے رہے اور یہ گروہ سرگرمِ عمل رہا۔ ان کی ٹیکنیک بڑی لطیف اور عمیق تھی۔ قرآنِ کریم نے، اپنے افتتاحیہ (سورۃ فاتحہ) کے بعد‘ پہلی سورۃ میں کہا ہے کہ: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (۲/۲) یہ وہ کتاب ہے جس میں شک و شبہ کی کوئی بات نہیں۔ یعنی یہ خود ایک کتاب ہے اور اس کے مندرجات سب کے سب حق و صداقت پر مبنی ہیں۔ قرآنِ مجید کے اس سب سے پہلے دعویٰ سے واضح ہے کہ اس سے وہی شخص یا وہی قوم راہ نمائی حاصل کر سکتی ہے جسے اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ ہو۔ جسے اس میں کسی قسم کا بھی شبہ پیدا ہو جائے وہ اس سے راہ نمائی حاصل نہیں کر سکتا۔ لہٰذا، اس گروہ کی ٹیکنیک یہ تھی کہ قرآنِ کریم میں مختلف نوعیتوں کے شبہات پیدا کئے جائیں۔ دیکھیئے، اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے کیا کیا کیا؟

قرآنِ مجید پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ:۔

(۱) اللہ تعالےٰ نے اسے وحی کے ذریعے نبی اکرمؐ پر نازل کیا۔

(۲) نبی اکرمؐ نے اسے بعینہٖ دوسرے انسانوں تک پہنچایا۔ اور جس شکل میں یہ آج ہمارے پاس موجود ہے، اسی شکل میں امت کو دیا۔ اس میں ایک حرف تک کا بھی ردّ و بدل نہیں ہوا۔ یہ خدا کی مکمل۔ غیر متبدل اور محفوظ کتاب ہے۔

اب آپ دیکھئے کہ اس گروہ نے، اس حقیقت میں شبہ پیدا کرنے کے لئے کیا کچھ کیا۔ واضح رہے کہ جو کچھ میں اس سلسلہ میں کہوں گا وہ سب ہماری ان کتبِ احادیث میں موجود ہے جنہیں صحیح ترین قرار دیا جاتا ہے۔ یعنی صحاح ستہ اور ان پر مشتمل کتب تفسیر میں۔ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ انہوں نے قرآنِ مجید کے جمع اور مرتب کرنے کے سلسلہ میں کس قسم کے افسانے وضع کئے۔

جمع القرآن کی روایات مختلف کتبِ احادیث میں بکھری پڑی ہیں۔ لیکن انہیں امام ابوبکر عبداللہ ابن ابی داؤد نے اپنی شہرۂ آفاق تالیف "کتاب المصاحف" میں یکجا کر دیا ہے۔ آپ حدیث کے مشہور امام ابو داؤدؒ کے

قرآن کیسے جمع ہوا

صاحبزادہ ہیں۔ وہ سنہ ۲۳۰ھ میں پیدا ہوئے اور انہوں نے سنہ ۳۱۶ھ میں وفات پائی۔ ان کی یہ کتاب علماءِ حدیث کے ہاں مستند کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ آپ دیکھئے کہ اس میں جمع القرآن کے متعلق کیا لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

> (حضرت) زیدؓ بن ثابت سے روایت ہے کہ جس سال اہلِ یمامہ کا قتل ہوا۔ (حضرت) ابوبکرؓ نے مجھے آدمی بھیج کر بلایا۔ وہاں (حضرت) عمرؓ بھی موجود تھے۔ (حضرت) ابوبکرؓ کہنے لگے کہ عمرؓ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ قرآن کے قاریوں کے ساتھ قتل کی گرم بازاری ہو گئی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ دوسرے مواقع پر بھی یہی گرم بازاری ہو اور اس طرح قرآن ضائع ہو جائے۔ میری رائے ہے کہ قرآن کو جمع کر لیں۔ میں نے عمرؓ سے کہا کہ جو کام رسول اللہؐ نے نہیں کیا وہ تم کیسے کرتے ہو۔ عمرؓ نے کہا۔ بخدا! یہ کام اچھا ہی ہے۔ اور اس بارے میں مجھ سے برابر کہتے رہے۔ حتیٰ کہ جس چیز کے لئے خدا نے ان کا شرحِ صدر کر دیا تھا، میرا بھی شرحِ صدر کر دیا۔ اور میری رائے بھی وہی ہو گئی جو ان کی تھی۔ ابوبکرؓ مجھ سے کہنے لگے تم نوجوان اور عقل مند آدمی ہو اور رسول اللہؐ کے لئے وحی لکھتے رہے ہو۔ ہم تمہیں متہم نہیں سمجھتے۔ لہٰذا، تم قرآن کو لکھ لو۔ زیدؓ بن ثابت کہتے ہیں کہ بخدا اگر وہ مجھے کسی پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ لے جانے کو کہتے تو وہ مجھ پر اس کام سے زیادہ دشوار نہ ہوتا۔ میں نے ان دونوں سے کہا کہ جو کام رسول اللہؐ نے نہیں کیا وہ کام تم کیسے کرتے ہو۔ ابوبکرؓ اور عمرؓ کہنے لگے کہ بخدا یہ کام اچھا ہی ہے۔ چنانچہ ابوبکرؓ اور عمرؓ برابر مجھ سے کہتے رہے۔ حتیٰ کہ جس امر کے لئے ان دونوں کا شرحِ صدر ہو چکا تھا، میرا بھی شرحِ صدر ہو گیا چنانچہ لکھنے کے لئے میں نے کاغذ کے ٹکڑوں، کھجور کے پٹھوں، پتھروں کے ٹکڑوں اور لوگوں کے سینوں سے تلاش کرنا شروع کیا۔ حتیٰ کہ ایک آیت جو حضورؐ کو پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا مجھے نہیں ملی۔ یعنی لقد جاءکم رسول من انفسکم..... چنانچہ میں نے اس کو ڈھونڈا۔ بالآخر خزیمہ بن ثابت کے پاس ملی اور میں نے اس کو اس کی سورت میں لکھ دیا۔

ضمناً، کتاب المصاحف میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ قرآن مجید کو درحقیقت حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جمع کیا تھا اور حضرت زیدؓ بن ثابت نے اس پر نظرِ ثانی کی تھی۔ نیز یہ بھی کہ جمع القرآن کا کام درحقیقت حضرت عمرؓ نے کیا تھا۔

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ حضرت زیدؓ بن ثابت نے کہا تھا کہ انہیں ایک آیت نہیں مل سکی تھی، لیکن کتبِ احادیث

ہیں کچھ اور بھی لکھا ملتا ہے۔ اسے غور سے سنئے۔ حضرت ابیؓ بن کعب سے یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ :-

حضرت زرؓ بن حبیش نے کہا ہے کہ مجھ سے حضرت ابیؓ بن کعب نے پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ سورۂ احزاب میں کتنی آیات تھیں ؟ میں نے کہا کہ یہی بہتر (۷۲) تہتر (۷۳)۔ (جو سورۂ احزاب میں موجود ہیں)۔ انہوں نے کہا کہ نہیں بلکہ سورۂ احزاب میں سورۂ بقرہ جتنی آیات تھیں۔ (یعنی ۲۸۶ آیات) ان میں ایک آیۂ رجم بھی تھی جس کی ہم تلاوت کیا کرتے تھے۔

(الاتقان فی علوم القرآن۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۵)

آیۂ رجم کے ساتھ کیا ہوا

آیۂ رجم کے متعلق سننِ ابن ماجہؒ میں (جو صحاح ستہ کی ایک مستند کتاب ہے) کہا گیا ہے کہ جب قرآنِ کریم مرتب کیا جانے لگا، تو صحابۂ کرامؓ کو دو آیتیں کہیں نہ مل سکیں۔ ایک آیت "رجم" سے متعلق تھی اور دوسری "رضاعت" سے متعلق۔ چنانچہ وہ ان آیات کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا کہ :-

آیۂ رجم اور آیۂ رضاعتِ کبیر ایک صحیفہ میں تھیں جو میرے تخت کے نیچے تھا۔ جب رسول اللہ کی وفات ہوئی تو ہم لوگ اس حادثہ میں مشغول ہو گئے۔ اتنے میں گھر کی پالتو بکری اندر گھس گئی اور اس صحیفہ کو کھا گئی۔

لہٰذا، ان دونوں آیتوں کا دنیا میں وجود ہی باقی نہ رہا۔ لیکن اس کے باوجود صحابہؓ کو اس پر اصرار تھا کہ رسول اللہ کے زمانے میں ہم آیۂ رجم کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ اور ایسا کہنے والوں میں حضرت عمرؓ بھی موجود تھے۔ لوگوں نے آپ سے کہا کہ جب آپ خود کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں آپ بھی اس آیت کی تلاوت کیا کرتے تھے تو آپ اسے قرآنِ حکیم میں درج کیوں نہیں کر دیتے۔ آپ نے فرمایا :-

میں اس آیت کو قرآن میں بلاشبہ درج کر دیتا لیکن ڈرتا ہوں کہ لوگ کہیں گے کہ عمرؓ نے خواہ مخواہ قرآن میں اضافہ کر دیا۔ (تفسیر کبیر از امام رازی نیا ایڈیشن۔ جلد صفحہ ۱۳۴)

اس پر سوال پیدا ہوا کہ پھر خدا کے اس حکم کی تعمیل کیسے ہو۔ آپ نے فرمایا کہ ہم اس آیت کو قرآن میں تو درج نہیں کریں گے۔ لیکن تعمیل اس کی کرتے رہیں گے۔ چنانچہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ زنا کی سزا رجم (سنگسار کرنا) ہے تو اس کی سند یہی ہے۔

جمع القرآن کے متعلق، جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے، اسے ہمارے علماء اور مفسرین آج تک صحیح مانتے چلے آ رہے ہیں۔ چنانچہ، سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ :-

رسول اللہ نے اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت قرآنِ پاک کو جس حالت میں چھوڑا، وہ یہ تھی کہ، اپنی مکمل اور مرتب صورت میں وہ صرف ان حافظوں کے سینے میں محفوظ تھا، جنہوں نے حضورؐ سے سیکھ کر از اوّل تا آخر، یاد کیا تھا۔ تحریری شکل میں آپ نے اس کا ــــــ لفظ لفظ لکھوا ضرور دیا تھا مگر وہ متفرق پارچوں پر۔ تختیوں۔ کھجوروں کی چھالوں۔ شانے کی ہڈیوں اور ایسی ہی دوسری چیزوں پر لکھا گیا تھا جو ایک تھیلے میں رکھی ہوئی تھیں۔ حضورؐ نے اسے سورتوں کی ترتیب

کے ساتھ ایک مسلسل کتاب کی صورت میں مرتب نہیں فرمایا تھا۔

(ترجمان القرآن۔ ستمبر ۱۹۷۵ء صـ ۳۵ و نومبر ۱۹۷۵ء صـ ۴۲)

ضمناً، اللہ تعالےٰ نے قرآنِ کریم کے متعلق، جو شروع ہی میں فرمایا ہے کہ: ذالك الكتٰب لا ريب فيه ، تو مودودی صاحب کی اس تحقیق کی رو سے "کتاب" سے مراد وہ تھیلا تھا جس میں قرآن کے منتشر اجزا کو بند کیا گیا تھا !۔ یا للعجب !

بہرحال، یہ تھا وہ طریق جس کے مطابق روایات کی رُو سے، قرآن کو جمع کیا گیا۔ عام عقیدہ یہ ہے کہ اس طرح جمع شدہ قرآن کا نسخہ حضرتِ عثمان رضؓ کے زمانے تک محفوظ تھا اور اسی سے انہوں نے دیگر نسخے نقل کرا کر مختلف شہروں میں بھیجے تھے۔ لیکن مودودی صاحب کی، اس بارے میں تحقیق کچھ اور کہتی ہے —— ان کا ارشاد ہے کہ:۔

چھ زبانوں والے قرآن تلف کر دیئے گئے

قرآنِ مجید درحقیقت سات[۷] زبانوں میں نازل ہوا تھا اور رسول اللہؐ نے بھی قرآن کو ان سات زبانوں میں ہی پیش کیا اور امت کو سکھایا تھا، لیکن حضرتِ عثمان رضؓ نے ان میں سے صرف ایک زبان والے قرآن کو باقی رکھا اور بقایا چھ زبانوں والے نسخوں کو جلا دیا تاکہ اُمت میں اختلاف پیدا نہ ہو۔ حالانکہ انہیں منسوخ کرنے کا حکم نہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے نازل ہوا اور نہ ہی رسولؐ اللہ کی زبانِ مبارک سے سنا گیا۔

(ترجمان القرآن۔ ستمبر ۱۹۷۵ء صـ ۳۹ و نومبر ۱۹۷۵ء صـ ۴۳)

مودودی صاحب کی اس تحقیق کی رُو سے، آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ حضرتِ عثمان رضؓ نے جس قرآن کو باقی رکھا اور جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ امت میں متواتر چلا آ رہا ہے، اس کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے۔ جن نسخوں کو (بقول مودودی صاحب) حضرت عثمان رضؓ نے ضائع کر دیا تھا، وہ سب منزل من اللہ تھے۔ اب کیسے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ان میں کیا لکھا تھا؟

بہرحال، مصحفِ عثمانی کے متعلق کتاب المصاحف میں کہا گیا ہے کہ:۔

جب (حضرت) عثمان رضؓ نے اسے دیکھا تو فرمایا کہ تم لوگوں نے بہت اچھا کیا اور خوب کیا، (کہ قرآن کو جمع کر دیا) مگر اس میں مجھے کچھ غلطیاں نظر آتی ہیں لیکن عرب انہیں اپنی زبانوں سے درست کر لیں گے۔

اسی کتاب میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ حجاج ابن یوسف نے اپنے زمانے میں حضرتِ عثمان رضؓ نے مصحف میں گیارہ[۱۱] جگہ پر تبدیلیاں کیں اور یہی قرآن آگے چلا۔

صحابہ رضؓ کے مختلف مصاحف

کتاب المصاحف میں (روایت کی سند کے ساتھ) یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب حضرت عثمان رضؓ نے قرآن مجید کا نسخہ مرتب کیا تو مختلف اکابرِ صحابہ رضؓ کے پاس اپنے نسخے تھے جن میں بے شمار آیات، ان آیات سے مختلف تھیں جو مصحفِ عثمانی

ہیں درج تھیں۔ اس مقام پر، یہ واضح کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب المصاحف کو ایک مستشرق، آرتھر جیفری (ARTHUR JEFERY) نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے اور وہ تمام آیات درج کر دی ہیں جو (روایات کی رو سے) مختلف صحابہ رضؓ کے نسخوں میں تھیں اور جو مصحفِ عثمانی میں درج شدہ آیات سے مختلف تھیں۔ ان نسخوں میں مختلف فیہ آیات کی تعداد حسبِ ذیل بتائی گئی ہے۔

(۱) حضرت ابنِ مسعود رضؓ (۱۳۲۲ آیات) ؛ (۲) حضرت ابی رضؓ بن کعب (۹۵۲) ؛ (۳) حضرت علی رضؓ (۸۹) ؛ (۴) حضرت ابنِ عباس رضؓ (۱۸۶) ؛ (۵) حضرتِ ابوموسیٰ رضؓ (۴) ؛ (۶) حضرت حفصہ رضؓ (۱۰) ؛ (۷) حضرت انس رضؓ بن مالک (۲۴) ؛ (۸) حضرت عمر رضؓ (۲۸) ؛ (۹) حضرت زید رضؓ بن ثابت (۱۰) ؛ (۱۰) حضرت ابنِ زبیر رضؓ (۳۴) ؛ (۱۱) حضرت عائشہ رضؓ (۱۳) ؛ (۱۲) حضرت سالم رضؓ (۲) ؛ (۱۳) حضرت امِ سلمہ رضؓ (۱۴) ؛ (۱۴) اور حضرت عبید رضؓ ابن عمیر (۱۸)۔

واضح رہے کہ یہ اختلافات محض لب و لہجہ کے نہیں تھے بلکہ بعض جگہ آیتوں کی آیتیں، اور اکثر مقامات پر الفاظ کے الفاظ ایک دوسرے سے بدلے ہوئے یا کم و بیش تھے۔ یہ تمام تفاصیل روایات میں موجود ہیں۔

ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ :-

> یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جس رسم الخط میں ابتداً نبی صلعم نے وحی کی کتابت کرائی تھی اور جس میں حضرت ابوبکر رضؓ نے پہلا مصحف مرتب کرایا اور حضرت عثمان رضؓ نے جس کی نقل بعد میں شائع کرائی اس کے اندر نہ صرف یہ کہ اعراب نہ تھے، بلکہ نقطے بھی نہ تھے۔ کیونکہ اس وقت تک یہ علامات ایجاد نہیں ہوئی تھیں۔

نقطوں اور اعراب کے بغیر

اس رسم الخط میں پورے قرآن کی عبارت یوں لکھی گئی تھی :-

> کںٮ احکمٮ اٮٮه ٮم ڡصلٮ مں لدں حکٮم حٮٮر (۱/۱۱)
>
> (ترجمان القرآن - بابت جون ۱۹۵۹ء)

اس طرح قرآنِ کریم کی کتابت کا نتیجہ کیا تھا، اس کے متعلق انہوں نے لکھا ہے :-

> اس طرزِ تحریر کی عبارتوں کو اہلِ زبان اٹکل سے پڑھ لیتے تھے اور بہرحال بامعنی بنا کر ہی پڑھتے تھے۔ لیکن جہاں مفہوم کے اعتبار سے متشابہ الفاظ آجاتے یا زبان کے قواعد و محاورہ کی رُو سے ایک ہی لفظ کے کئی تلفظ یا اعراب ممکن ہوتے، وہاں خود اہلِ زبان کو بھی، بکثرت التباسات پیش آجاتے اور یہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا کہ لکھنے والے کا منشا کیا تھا۔ (ایضاً)

اس کے بعد آپ غور فرمائیے کہ قرآنِ مجید کے متعلق اعتماد کیا باقی رہ سکتا ہے اور یقین کیا؟ عربی زبان کا ایک ابجد خوان بھی اس حقیقت سے واقف ہوتا ہے کہ نقطوں اور اعراب کے بغیر اس زبان کی کسی عبارت کے معانی بھی یقینی طور پر متعین نہیں کئے جا سکتے اور محض نقطوں اور اعراب کے اختلاف سے اس کے معانی میں کس قدر اختلاف ہو سکتا ہے۔ مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ قرآن پر اعراب لگانے کی ضرورت سب سے پہلے بصرہ کے گورنر زیاد نے محسوس کی جو ۴۵ھ سے ۵۳ھ تک وہاں کا گورنر تھا۔ اس نے ابوالاسود سے فرمائش

کی کہ وہ اعراب کے لئے علامات تجویز کریں۔ اس کے بعد عبدالملک بن مروان (۶۵ھ تا ۸۶ھ) کے عہدِ حکومت میں حجاج بن یوسف والیٔ عراق نے دو علماء کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ قرآن کے متشابہ حروف میں تمیز کرنے کی کوئی صورت تجویز کریں۔ چنانچہ انہوں نے پہلی مرتبہ عربی زبان کے حروف میں بعض کو منقوط اور بعض کو غیر منقوط کرکے اور منقوط کے اوپر یا نیچے ایک سے لے کر تین تک نقطے لگا کر فرق پیدا کیا اور ابوالاسود کے طریق کو بدل کر اعراب کے لئے نقطوں کے بجائے زیر۔ زبر۔ پیش کی وہ حرکات تجویز کیں جو آج تک مستعمل ہیں۔

(طلوعِ اسلام۔ نومبر ۱۹۵۹ء۔ صفحہ ۲۹)

مودودی صاحب کے اس بیان سے واضح ہے کہ جو قرآنِ مجید اُمت میں مستعمل ہے اس کے نقطے اور اعراب، عراق کے غیر معروف دو عالموں کی صوابدید کے رہینِ منت ہیں۔ انہی کے مطابق قرآنی آیات کے معانی متعین کئے جاتے ہیں۔ کیا معلوم کہ جو قرآن اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا تھا اس کی آیات کے معانی کیا تھے؟ بالفاظِ دیگر مودودی صاحب کی تحقیق کے مطابق، سات زبانوں کے جو قرآن خدا نے نازل کئے تھے ان میں سے چھ زبانوں کے قرآن حضرت عثمانؓ نے تلف کر دیئے۔ جو ایک باقی رہا، اس پر معانی متعین کرنے کی علامات (نقطے اور اعراب) عراق کے دو عالموں نے تجویز کیں! اس کے بعد سوچئے کہ موجودہ قرآن کی حیثیت کیا رہ گئی؟

(ضمناً) طلوعِ اسلام نے اسی زمانے میں دو تین بسوط مقالات شائع کئے جن میں مستند طور پر یہ بتایا کہ مودودی صاحب نے قرآنِ مجید میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش میں، خود اپنے آپ کو عربی زبان اور اس کی تاریخ سے کس قدر ناواقف ثابت کیا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے طلوعِ اسلام بابت نومبر ۱۹۵۹ء و فروری ۱۹۶۱ء و اکتوبر ۱۹۷۰ء) ان مقالات میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ عربی زبان میں ابتداء ہی سے نقطے موجود تھے، اور قرآنِ مجید کے الفاظ پر اعراب بھی۔

اوپر بتایا گیا ہے کہ روایات کی رُو سے، مختلف صحابہؓ کے پاس، قرآنِ کریم کے ایسے نسخے موجود تھے جن میں ایسی آیات درج تھیں جو مصحفِ عثمانی میں درج شدہ آیات سے مختلف تھیں۔ آپ شاید خیال کرتے ہوں کہ یہ اختلافات اسی زمانے میں ختم ہو گئے ہوں گے کیونکہ قرآنِ کریم کا جو نسخہ امت میں متواتر چلا آ رہا ہے، اس میں یہ اختلافی آیات موجود نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس میں یہ اختلافی آیات موجود نہیں۔ لیکن ان اختلافی آیات کو اب بھی منزل من اللہ آیات مانا جاتا ہے۔ آپ نے تفاسیر میں اکثر لکھا دیکھا ہوگا کہ قراءتِ حضرت ابنِ عباسؓ میں یوں آیا ہے: اور

اختلافِ قراءت

اس کے بعد اختلافی آیت لکھی ملتی ہے۔ "قراءتِ حضرت ابنِ عباسؓ" کے معنی یہ ہیں کہ ان کے مصحف میں یہ آیت یوں لکھی ہوئی تھی۔ ان قراءتوں کے اختلاف کی دو ایک مثالیں ملاحظہ فرمایئے:۔

مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کے سلسلے میں قرآنِ کریم میں ان رشتوں کی تفصیل دینے کے بعد، جن سے نکاح حرام ہے، کہا گیا ہے:۔

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً .... (۴/۲۴)

اور جو اس کے سوا ہیں وہ تمہارے لئے حلال ہیں، اس طرح کہ تم ان کو اپنے مالوں کے ساتھ چاہو، نکاح میں لا کر نہ کہ شہوت رانی کرتے ہوئے۔ سو تم ان میں سے، جس کے ساتھ نفع اٹھانا چاہو تو انہیں ان کے مقرر کردہ مہر دے دو۔

سنیوں کے ہاں اس معاہدہ کا نام نکاح ہے جو مہر ادا کرکے دائمی طور پر کیا جاتا ہے اور جو موت یا طلاق سے فسخ ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس شیعہ حضرات متعہ کے قائل ہیں جس میں ایک مرد اور ایک عورت ایک مدتِ معینہ کے لئے مباشرت کا معاملہ طے کر لیتے ہیں اور اس کے لئے ———— اس عورت کو جنسی اختلاط کا معاوضہ دے دیا جاتا ہے۔ سنیوں کے ہاں متعہ حرام ہے۔

حضرت عبداللہ ابنِ عباس رضؓ سنیوں کے جلیل القدر صحابی ہیں۔ ان کی قرأت میں مندرجہ بالا آیت یوں آئی ہے:-

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ....

تم ان میں سے ایک مدتِ معینہ کے لئے فائدہ اٹھاؤ۔

یعنی اس قرأت کی رو سے، آیتِ قرآن میں اِلیٰ اَجَلٍ مُّسَمًّى کا اضافہ کیا گیا ہے جس سے متعہ کی سند مل جاتی ہے۔ اس اضافہ کے متعلق حضرتِ ابن عباس رضؓ نے کیا کچھ فرمایا ہے اس کی تفصیل سنیوں کی سب سے پہلی اور قابلِ اعتماد تفسیر طبری میں لکھا ہے:-

ابو نضرہ کی روایت ہے کہ میں نے ابنِ عباس رضؓ سے متعہ کے متعلق دریافت کیا۔ انہوں نے کہا کہ کیا تم سورۃ النساء کی تلاوت نہیں کرتے۔ میں نے کہا، کیوں نہیں۔ کہا، پھر اس میں یہ آیت نہیں پڑھا کرتے کہ "فاستمتعتم بہ منھن الیٰ اجل مسمی"۔ میں نے کہا۔ نہیں۔ میں اگر اس طرح پڑھتا ہوتا تو آپ سے دریافت کیوں کرتا۔ انہوں نے کہا اچھا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اصلی آیت یونہی ہے۔ عبدالاعلیٰ کی روایت میں بھی ابونضرہ سے اس طرح کا واقعہ منقول ہے۔ تیسری روایت میں بھی ابونضرہ سے نقل ہے کہ میں نے ابن عباس رضؓ کے سامنے یہ آیت پڑھی۔ فاستمتعتم بہ منھن —— ابن عباس رضؓ نے کہا: الیٰ اجل مسمی۔ میں نے کہا۔ میں تو اس طرح نہیں پڑھتا۔ انہوں نے تین مرتبہ کہا۔ "خدا کی قسم! خدا نے اسی طرح نازل کیا ہے۔"

(۲) متعہ کے علاوہ شیعہ اور سنی میں ایک اختلاف وضو کے متعلق بھی ہے۔ سنی وضو میں پاؤں دھوتے ہیں اور شیعہ پاؤں پر مسح کرتے ہیں۔ اس باب میں مودودی صاحب کی تفسیر غور طلب ہے۔ وضو کا حکم سورۃ المائدہ کی آیت ۶ میں ان الفاظ میں آیا ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ۔ (۵/۶)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب تم اٹھو نماز کے لئے تو دھوؤ اپنے منہ اور اپنے ہاتھ کہنیوں تک، اور مسح کرو اپنے سروں پر اور دھوؤ اپنے پاؤں ٹخنوں تک۔

یہ آیت درج کرنے کے بعد مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

اس میں لفظ وارجلکم کی دو قرأتیں متواتر ہیں۔ نافع، ابنِ عامر، حفص، کسائیؒ اور یعقوب کی قرأت وَاَرْجُلَکُمْ (بفتحِ لام) ہے اور ابنِ کثیر۔ حمزہ، ابوعمرو اور عاصم کی قرأت وَاَرْجُلِکُمْ (بکسرِ لام) ہے۔ ان میں سے کسی قرأت کی حیثیت بھی یہ نہیں کہ بعد میں کسی وقت بیٹھ کر نحویوں نے اپنے اپنے فہم اور منشار کے مطابق الفاظِ قرآنی پر خود اعراب لگا دیئے ہوں۔ بلکہ یہ دونوں قرأتیں متواتر طریقے سے منقول ہوئی ہیں۔ اب اگر پہلی قرأت اختیار کی جائے تو ارجلکم ——— کا تعلق فَاغْسِلُوْا کے حکم سے جڑتا ہے اور معنی یہ ہو جاتے ہیں۔ "اور دھوؤ اپنے پاؤں ٹخنوں تک" اور اگر دوسری قرأت قبول کی جائے تو اس کا تعلق وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِکُمْ سے قائم ہوتا ہے اور معنی یہ نکلتے ہیں۔" اور مسح کرو اپنے پاؤں پر ٹخنوں تک۔" (ترجمان القرآن۔ بابت فروری ۱۹۵۹ء)

ظاہر ہے کہ ان دو قرأتوں کی رو سے قرآنِ کریم میں تضاد واقع ہوتا ہے۔ یعنی وہ پاؤں دھونے کا بھی حکم دیتا ہے اور مسح کرنے کا بھی۔ حالانکہ اس نے واضح طور پر کہا ہے کہ اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی تضاد نہیں۔ (۴/۸۲) لیکن مودودی صاحب ان دونوں قرأتوں کو صحیح تسلیم کرتے ہیں جن کی رو سے قرآنی حکم میں بالبداہت تضاد واقع ہو جاتا ہے۔

اختلافِ قرأت کا یہ عقیدہ بھی ہمارے ہاں مسلمہ ہے۔ (واضح رہے کہ ہم نے اس بحث میں شیعہ حضرات کے عقائد کا ذکر قصداً نہیں کیا ورنہ ان کے ہاں "الکافی" میں متعدد ایسی آیات درج ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ مروجہ قرآن کی یہ آیت دراصل یوں نازل ہوئی تھی۔ یعنی ان کے عقیدہ کی رو سے، آیاتِ قرآنی میں اختلافِ قرأت ہی نہیں بلکہ صریحاً تحریف کی گئی ہے۔ مثلاً زیرِ نظر آیت نازل تو اَرْجُلِکُمْ ہی ہوئی تھی لیکن اس میں تحریف کر کے مصحفِ عثمانی میں اسے اَرْجُلَکُمْ درج کر دیا گیا)۔

اختلافِ "قرأت" (یا بالفاظِ صریح تحریف فی القرآن) کی یہ مثالیں احکام سے متعلق تھیں۔ اب ایک ایسی مثال دیکھیے جس سے دین کی اصل و بنیاد تک ہل جاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے مامورین من اللہ کے لئے رسول یا نبی کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ انہیں خدا کی طرف سے وحی ملتی تھی۔ سورۂ حج کی آیت ۵۲ (۲۲/۵۲) میں ہے:۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔ (۲۲/۵۲)

(اے رسول!) ہم نے تجھ سے پہلے جتنے رسول یا نبی بھیجے ان میں سے کوئی ایسا نہیں جس کے ساتھ یہ ماجرا نہ گذرا ہو کہ اس کے چلے جانے کے بعد دین کے دشمنوں نے اس کی وحی میں آمیزش نہ کر دی ہو۔

---

۱ مودودی صاحب نے پہلے کہا کہ ابتداء میں قرآنِ کریم کی جس طرح کتابت ہوئی اس میں الفاظِ قرآنی پر اعراب نہیں تھے۔ اگر صورت یہ تھی تو ارجلکم کے ل زبر اور زیر کی تفریق کس طرح کی گئی تھی اور یہ دونوں قرأتیں کس طرح منقول ہوئی تھیں۔

جب ایسا ہوتا تو خدا ایک اور رسول بھیج دیتا اور سابقہ وحی کی اس آمیزش کو دور کر کے اپنے قوانین کو محکم بنا دیتا۔ اسلئے کہ خدا علیم بھی ہے اور حکیم بھی۔

اس آیت سے واضح ہے کہ خدا کی طرف سے رسول یا نبی آتے تھے۔ لیکن حضرت ابنِ عباسؓ کی قرأت میں یہ آیت یوں آئی ہے۔ وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی ولا محدث ...... الخ۔ یعنی اس میں رسول اور نبی کے ساتھ مُحَدَّث (دَ کے زبر کے ساتھ) کا اضافہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی طرف سے رسول۔ نبی اور محدّث آیا کرتے تھے۔

محدّث کا عقیدہ

مَیں نے اپنے اس مقالہ میں شیعہ حضرات کے عقیدہ اور مسلک کے متعلق بحث نہیں کی لیکن چونکہ زیرِ نظر آیت میں اضافہ کا تعلق اصولاتِ دین سے ہے اس لئے اس باب میں ان کی ایک روایت کا ذکر ناگزیر ہے۔ کتاب الکافی شیعہ حضرات کا احادیث کا معتبر ترین مجموعہ ہے۔ اس میں عقیدۂ محدّث کے سلسلہ میں حسبِ ذیل روایت درج ہے۔

زرارہ سے مروی ہے کہ میں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے آیۂ کان " رسولاً نبیاً " کے متعلق سوال کیا اور پوچھا کہ نبی اور رسول میں کیا فرق ہے۔ فرمایا نبیؔ وہ ہے جو فرشتہ کو خواب میں دیکھتا ہے۔ اس کی آواز سنتا ہے لیکن ظاہر بظاہر حالتِ بیداری میں نہیں دیکھتا۔ اور رسول وہ ہے جو آواز بھی سنتا ہے۔ خواب میں بھی دیکھتا ہے اور ظاہر بین بھی۔ میں نے پوچھا امام کی منزلت کیا ہے؟ فرمایا وہ فرشتہ کی آواز سنتا ہے مگر دیکھتا نہیں۔ پھر یہ آیت پڑھی۔ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِیٍّ وَّ لَا مُحَدَّثٍ۔

(الکافی کا اُردو ترجمہ الشافی۔ جلد اوّل۔ صـــ۲۰۳ـــ۔ شائع کردہ شمیم بک ڈپو۔ کراچی)

اصولِ کافی (عربی) میں اس روایت کے تحت حاشیہ میں لکھا ہے۔ انما ھو فی قرأتہ اھل بیت علیھم السلام (جلد اول صـــ۱۷۶ـــ) یعنی اہلِ بیت کی قرأت میں اس آیت میں " ولا محدث " کے الفاظ آئے ہیں۔ اس سے اگلی روایت میں ہے:۔

محدث وہ ہے جو ملائکہ سے ہم کلام ہوتا ہے۔ ان کا کلام سنتا ہے لیکن اسے دیکھتا نہیں، اور نہ اسے خواب نظر آتا ہے۔ (الشافی۔ جلد اول۔ صـــ۲۰۴ـــ)

اس کے بعد ایک روایت میں ہے کہ:۔

حضرت علیؓ نے فرمایا کہ " میں اور میرے صلب میں سے گیارہ امام محدث ہیں "

(الشافی۔ جلد اوّل۔ صـــ۲۸۱ـــ) ؁۱

ختمِ نبوت کا عقیدہ اسلام کا اصل الاصول ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی راہنمائی کے لئے جو کچھ دینا تھا وہ حضور نبی اکرمؐ کی طرف نازل کردہ وحی میں تکمیل تک پہنچ گیا اور قرآنِ مجید کی دفتین میں

؁۱ میں نے اس بحث کو اپنی کتاب " شاہکارِ رسالت " میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

محفوظ کر دیا گیا۔ اس طرح حضورؐ کے بعد، خدا کی طرف سے راہ نمائی ملنے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لہٰذا آپ آخری نبی اور رسول ہیں۔ میرزا غلام احمد (قادیانی) نے مامور من اللہ ہونے کا دعویٰ کیا اور اس پر سخت اعتراضات ہوئے تو انہوں نے کہا :-

آپ لوگ کیوں قرآن شریف میں غور نہیں کرتے اور کیوں سوچنے کے وقت غلطی کھا جاتے ہیں۔ کیا آپ صاحبوں کو خبر نہیں کہ صحیحین سے ثابت ہے کہ آنحضرت (صلعم) اس اُمت کے لئے بشارت دے چکے ہیں کہ اس اُمت میں بھی پہلی اُمتوں کی طرح محدث پیدا ہوں گے۔ اور محدث، بفتح دال وہ لوگ ہیں جن سے مکالمات و مخاطباتِ الٰہیہ ہوتے ہیں۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ ابن عباسؓ کی قرأت میں آیا ہے۔ وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی ولا محدث...... (آخر تک) پس اس آیت کی رو سے بھی جس کو بخاری نے بھی لکھا ہے، محدث کا الہام یقینی اور قطعی ثابت ہوتا ہے جس میں دخل شیطان کا قائم نہیں رہ سکتا۔

(براہین احمدیہ۔ شائع کردہ انجمن احمدیہ اشاعتِ اسلام۔ لاہور صفحہ ۳۴۸ حاشیہ در حاشیہ)

آپ دیکھئے کہ میرزا صاحب نے وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی ولا محدث کو "آیت" کہا ہے یعنی مروجہ قرآنِ کریم میں جو آیا ہے کہ وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی۔ وہ بھی قرآن کی آیت ہے۔ اور " ولا محدث " کے اضافہ کے ساتھ بھی قرآن کی آیت ہے۔

اس (ولا محدث کے اضافہ والی) آیت کو بنیاد قرار دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :-

ہمارے سید الرسول اللہ، خاتم الانبیاء ہیں اور بعد آنحضرت کوئی نبی نہیں آ سکتا۔ اس لئے شریعت میں نبی کے قائمقام محدث رکھے گئے ہیں[1]

(شہادت القرآن۔ صفحہ ۲۸)

نبی کے قائم مقام ——— محدث !

آپ نے دیکھا کہ اختلافِ قرأت کا باطل عقیدہ بات کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ لیکن بایں ہمہ اسے صحیح مانا جاتا ہے۔

ان مثالوں سے (جو بکثرت موجود ہیں) یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قرآنِ کریم اس شکل میں بھی نازل ہوا تھا جو مروجہ نسخوں میں ہے اور ان شکلوں میں بھی جو مختلف قرأتوں میں موجود ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ قرآنِ مجید کے شک و شبہ سے بالاتر ہونے کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے !

اب آگے بڑھئے۔ مروجہ قرآنِ کریم (معاذ اللہ) جیسا تیسا بھی ہے اس کے متعلق ایک اور عقیدہ وضع کیا گیا ——— اور وہ یہ کہ قرآنِ کریم کی بے شمار آیات ایسی ہیں جو صرف تلاوت کے لئے قرآن میں رہنے دی گئی ہیں لیکن ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے کہیں یہ نہیں کہا کہ فلاں آیت ناسخ ہے اور فلاں آیت

---

[1] میرزا صاحب کے دعاوی کی حقیقت کے متعلق، میری کتاب "ختم نبوت اور تحریک احمدیت" دیکھئے۔

ناسخ و منسوخ

منسوخ۔ اس پر آپ متعجب ہوں گے کہ پھر اس بات کا فیصلہ کس نے کیا کہ فلاں آیت منسوخ ہے ——— اس کا فیصلہ محدثین نے کیا۔ مفسرین نے کیا۔ علماء نے کیا۔ فقہاء نے کیا۔ یعنی انہیں یہ اتھارٹی حاصل ہو گئی کہ وہ خدا کی طرف سے نازل کردہ آیات کو منسوخ قرار دے دیں۔ کسی زمانے میں اس قسم کی منسوخ شدہ آیات کی تعداد ۵۰۰ تک پہنچتی تھی۔ پھر یہ گھٹتے گھٹتے شاہ ولی اللہؒ کے زمانے میں پانچ تک رہ گئی۔ لیکن پانچ سو ہوں یا پانچ، یہ عقیدہ اب بھی موجود ہے کہ قرآنِ کریم میں ایسی آیات موجود ہیں جن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے اور وہ صرف تلاوت کے لئے باقی ہیں۔ مثلاً مودودی صاحب اپنی تفسیر تفہیم القرآن، جلد اوّل (۱۹۵۱ - ایڈیشن) میں روزے سے متعلق آیت ($\frac{۲}{۱۸۳}$) کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ:-

> ۲ھ میں رمضان کے روزوں کا یہ حکم قرآن میں نازل ہوا مگر اس میں اتنی رعایت رکھی گئی کہ جو لوگ روزے کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور پھر بھی روزہ نہ رکھیں، وہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ بعد میں، دوسرا حکم نازل ہوا اور یہ عام رعایت منسوخ کر دی گئی۔ (صفحہ ۱۴۱)

"یہ عام رعایت منسوخ کر دی گئی" مودودی صاحب کا اپنا فیصلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نہ پہلے "یہ" رعایت دی، نہ بعد میں اسے منسوخ کیا۔ خدائے علیم و خبیر اس سے بلند و بالا ہے کہ وہ ایسے احکام دے جنہیں خود ہی بعد میں منسوخ کرنا پڑے۔

اس سے بھی آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اس عقیدے کے بعد آیاتِ قرآنی کی محکمیت کے متعلق کس قدر یقین باقی رہ سکتا ہے؟

ناسخ اور منسوخ کے متعلق یہی عقیدہ نہیں کہ قرآنِ کریم کی ایک آیت کو خود قرآن ہی کی دوسری آیت منسوخ کر سکتی ہے بلکہ یہ عقیدہ بھی رائج کیا گیا کہ قرآنی آیات کو احادیث بھی منسوخ کر سکتی ہیں۔ اس پر جب یہ اعتراض

وحی کی دو قسمیں

وارد ہوا کہ وحی کو غیر وحی کس طرح منسوخ کر سکتی ہے؟ تو کہا گیا کہ وحیٔ خداوندی ساری کی ساری قرآن مجید کے اندر ہی درج نہیں۔ اس کا بہت تھوڑا حصہ قرآن میں ہے اور کثیر حصہ احادیث میں۔ چنانچہ جمعیتِ اہلِ حدیث کے سابق صدر، مولانا محمد اسمٰعیل (مرحوم) اپنی کتاب "جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث" میں لکھتے ہیں:-

> تحقیق و تثبیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآنِ عزیز کا ہے۔ اور فی الحقیقت اس انکار کا ایمان اور دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآنِ عزیز کے انکار کا .... جبرائیل قرآن اور سنت دونوں لے کر نازل ہوتے تھے۔ آنحضرتؐ کو سنت بھی قرآن کی طرح سکھاتے تھے۔ اس لحاظ سے ہم وحی میں تفریق کے قائل نہیں۔

یعنی جو وحی قرآن میں درج ہے اور جو احادیث میں درج ہے، دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے، حضرت جبرائیل کی وساطت سے رسولؐ اللہ کو ملی تھیں اور دونوں کا درجہ اور مقام ایک ہی ہے۔ مولانا محمد اسمٰعیل (مرحوم) کے الفاظ میں "جو احادیث قواعدِ صحیحہ اور ائمہ سنت کی تصریح کے مطابق صحیح ثابت ہوں، ان کا انکار کفر ہوگا اور ملّت سے

خروج کے مرادف۔" (ایضاً)

مودودی صاحب اس باب میں فرماتے ہیں کہ:۔

> رسول اللہ نے جو کچھ استاد کی حیثیت سے بتایا اور سکھایا ہے وہ بھی اسی طرح خدا کی طرف سے ہے جس طرح قرآن خدا کی طرف سے ہے۔ اس کو غیر از قرآن کہنا صحیح نہیں ہے۔
>
> (تفہیمات حصہ اوّل - صفحہ ۳۳۶)

اس سوال کے جواب میں، کہ وحی کو ان دو حصوں میں تقسیم کرنے کا مقصد کیا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ اگر پوری کی پوری وحی کو قرآن کریم میں درج کر دیا جاتا تو:

> قرآن مجید کم از کم انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے برابر، ضخیم ہو جاتا اور وہ تمام فوائد باطل ہو جاتے جو اس کتاب کو محض ایک مختصر سی اصولی کتاب رکھنے سے حاصل ہوئے ہیں۔ (ایضاً۔ ص ۳۳۷)

ضمناً، لگے ہاتھوں آپ یہ بھی دیکھتے جایئے کہ یہی مودودی صاحب جو یہ فرماتے ہیں کہ وحی ہونے کی جہت سے قرآن اور حدیث میں کوئی فرق نہیں، دوسرے مقام پر، اس باب میں کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ وہ ترجمان القرآن بابت ستمبر ۱۹۵۲ء میں لکھتے ہیں:۔

> قرآن کے کلام اور محمد صلعم کے اپنے کلام میں زبان اور اسلوب کا اتنا نمایاں فرق ہے کہ کسی ایک انسان کے دو اس قدر مختلف سٹائل کبھی نہیں ہو سکتے۔ یہ فرق صرف اسی زمانے میں واضح نہیں تھا جبکہ نبی صلعم اپنے ملک کے لوگوں میں رہتے سہتے تھے۔ بلکہ آج بھی حدیث کی کتابوں میں آپ کے سینکڑوں اقوال اور خطبے موجود ہیں۔ ان کی زبان اور اسلوب قرآن کی زبان اور اسلوب سے اس قدر مختلف ہے کہ زبان و ادب کا کوئی رمز آشنا نقاد یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے کلام ہو سکتے ہیں۔

اس سے یقیناً آپ کے دل میں یہ خیال ابھرے گا کہ مودودی صاحب نے، یہ متضاد باتیں کیسے کہہ دیں۔ اگر آپ کے دل میں یہ خیال ابھرتا ہے تو یہ مودودی صاحب کے متعلق آپ کی ناواقفیت کی دلیل ہے۔ ان کے ہاں تو قریب قریب ہر مسئلہ میں اس قسم کے تضادات موجود ہوتے ہیں۔ ان کا عام معمول یہی ہے۔

ہم، بہرحال کہہ یہ رہے تھے کہ قرآن کریم کے متعلق، ایک عقیدہ یہ بھی وضع کیا گیا کہ وحی خداوندی، ساری کی ساری قرآن ہی میں درج نہیں۔ وحی کا معتدبہ حصہ احادیث میں درج ہے۔ اسی لئے احادیث کو "مثلہ معہ" کہا جاتا ہے۔ یعنی قرآن کی مثل اس کے ساتھ۔ یہ الگ بات ہے کہ "مثلہ معہ" کے مجموعے ہر فرقے کے الگ الگ ہیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس عقیدہ کی رو سے بات کیا بنی؟ جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کے اعتراضات کے جواب میں کہا تھا کہ: اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ (29/51) کیا وہ کتاب جسے تو ان کے سامنے پیش کرتا ہے، ان کے لئے کافی نہیں" جو یہ اس کے ساتھ کچھ اور بھی چاہتے ہیں؟ قرآن مجید سے الگ اور خارج، دوسری وحی کے عقیدہ کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی کتاب انسانی راہنمائی

کے لئے کافی نہیں۔ اس کے ساتھ، اس کی مثل (مثلہ معہ) کچھ اور کی بھی ضرورت تھی جسے اس دوسری وحی نے پورا کیا ہے! آپ کو معلوم ہے کہ اب قرآنِ مجید کو انسانی راہ نمائی کے لئے کافی سمجھنے والوں کے متعلق کیا کہا جاتا ہے؟

میرا عقیدہ اور ایمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی راہ نمائی کے لئے جو کچھ عطا کرنا تھا وہ اصول و اقدار (اور بعض معاملات میں احکام) کی شکل میں قرآن کریم میں مکمل طور پر موجود ہے۔ اس طور پر قرآن مجید، انسانی راہ نمائی کے لئے کافی ہے۔ اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کے اتباع میں، ان اصول و اقدار کی روشنی میں جزئی قوانین وضع کرے۔ اس مسلک کی بنا پر مجھے منکرِ حدیث اور نہ جانے کیا کیا کہا جاتا ہے۔ یعنی میرا جرم یہ ہے کہ

حسبنا کتاب اللہ

میں حسبنا کتاب اللہ (ہمارے لئے کتاب اللہ کافی ہے) کیوں کہتا ہوں[1]۔ یہ الفاظ (حسبنا کتاب اللہ) میرے نہیں۔ یہ حضرت عمرؓ کے ہیں جو انہوں نے نبی اکرمؐ کی وفات سے چند روز قبل ارشاد فرمائے تھے حسبنا کتاب اللہ کہنے کی وجہ سے میرے خلاف کفر کے فتوے صادر کرنے والوں سے، شیعہ حضرات نے ایک بڑی چبھتی ہوئی بات کہی ہے۔ (جیسے کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) شیعہ حضرات کی احادیث کی کتاب الکافی کا الشافی کے نام سے اردو ترجمہ شائع ہوا ہے۔ اس کے مقدمہ میں فتنۂ انکارِ حدیث کے عنوان سے کہا گیا ہے۔

> مگر افسوس ہے کہ باایں ہمہ مسلمانوں میں ہمیشہ سے ایک ایسا گروہ بھی موجود رہا ہے جو نہ صرف یہ کہ حدیث کی افادیت کا منکر ہے بلکہ وہ یہ کہتا ہے کہ ـــــ ایں دفترِ بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ ـــ اس فتنہ کا حجرِ اساس تو پیغمبرِ اسلام کے آخری لمحات میں آنجناب کے مطالبہ قلم و دوات کے جواب میں حسبنا کتاب اللہ (بخاری شریف) طبع مجتبائی۔دہلی جلد۲۔ ص۶۳۸۔ مشکوٰۃ۔ ص۵۸۴۔ طبع اصح المطابع دہلی) کہہ کر دیا گیا تھا۔ اور انہی حسبنا کتاب اللہ کے قائل کے دورِ خلافت میں حدیث بیان کرنے والوں کو دُرّے لگتے تھے۔ (الفاروق شبلی نعمانی۔ طبع غلام علی اینڈ سنز۔ ص۲۴۷)
>
> یہ نظریۂ فاسدہ اسلام کے مختلف ادوار سے گذر کر مولوی چکڑالوی اور مسٹر پرویز[2] کے وقت برگ و بار لے آیا۔ اب جبکہ اپنے اصلی رنگ و روپ اور حقیقی خد و خال کے ساتھ منظرِ عام پر ظاہر ہوا ہے تو حسبنا کتاب اللہ کے قائل بھی چلّا اٹھے ہیں اور اس خیال کے ابطال پر متعدد کتب و رسائل لکھ ڈالے ہیں، مگر ان حضرات کو یہ کون سمجھائے کہ ــــ اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست! اور خود کردہ را علاجے نیست! (مقدمہ صفحہ ب/۳)

مطلب واضح ہے۔ یعنی سُنّی حضرات، آج حسبنا کتاب اللہ کہنے والوں کے خلاف تو کفر کے فتوے صادر کرتے ہیں

---

[1] علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں اس ارشادِ فاروقیؓ کو اسلام کے احیاء کے لئے شرطِ اوّل قرار دیا ہے۔

[2] مولوی عبداللہ چکڑالوی یا فرقہ اہلِ قرآن کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں ان کے مسلک کے سخت خلاف ہوں، اور اس موضوع پر بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔

لیکن جس نے (یعنی حضرت عمر فاروقؓ نے) اس فتنہ کا سنگِ بنیاد رکھا تھا اسے خلیفۂ راشد تسلیم کرتے ہیں!

یہ حضرات عام طور پر، کہتے ہیں کہ ہم اسی حدیث کو صحیح مانتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو۔ لیکن یہ بھی صحیح نہیں۔ ماہنامہ "فکر و نظر" کی دسمبر ۱۹۶۵ء کی اشاعت میں لکھا گیا کہ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:۔

جب کوئی حدیث میری نسبت بیان کی جائے تو اس کا مقابلہ کتاب اللہ سے کرو۔ اگر قرآن کے حکم کے مطابق ہو تو قبول کرو ورنہ اسے چھوڑ دو۔

حدیث پرکھنے کا معیار

اس پر جماعتِ اہلِ حدیث کے ترجمان الاعتصام (لاہور) نے سخت احتجاج کیا اور اپنی ۲۳ جنوری ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں لکھا:۔

واضح رہے کہ یہ بات جو مقالہ نگار نے لکھی ہے جتنی بڑی شہرت پذیر ہے، اسی قدر یہ بڑا جھوٹ ہے جو رسول اللہ کے ذمے لگایا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس زمانے میں یہ روایت گھڑ کر رسول اللہ کی طرف منسوب کی گئی، اسی دور میں ماہرینِ فنِ حدیث ائمہ کرامؒ نے ببانگِ دہل اعلان کر دیا تھا کہ یہ ہرگز ہرگز فرمانِ رسول نہیں بلکہ یہ عبارت زنادقہ (گمراہ لوگوں) کی وضع کردہ ہے۔ چنانچہ چوتھی صدی کے نامور فقیہہ و محدث امام خطابیؒ نے تصریح فرمائی ہے۔ (تذکرۃ الموضوعات للفتنی۔ ص ۲۸۔ و مولانا عبدالحی لکھنوی حنفی کی ظفرالامانی صفحہ ۲۶۷ نیز جامع بیان العلم لابن عبدالبر جلد ۲ صفحہ ۱۹۱)

بات واضح ہے۔ یعنی جب، ان حضرات کے عقیدہ کی رو سے، حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے تو اس کے مطابقِ قرآن ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

روایات کی رو سے قرآن کی تفسیر

حدیث کی اسی حیثیت کی رو سے، یہ ضروری قرار دیا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم کو بھی احادیث کی رو سے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ یعنی آیاتِ قرآنی کی وہی تفسیر صحیح تسلیم کی جائے گی جو احادیث کے مطابق ہو۔ اس سلسلے میں ہم بیسیوں روایات پیش کر سکتے تھے جن سے معلوم ہو جاتا ---- کہ روایات کس قسم کی تفسیر پیش کرتی ہیں۔ ہم صرف دو ایک مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

۱۔ قرآنِ کریم میں شرح و بسط سے بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تنگ کیا کرتے تھے۔ ان واقعات کو سامنے لا کر اللہ تعالےٰ نے جماعتِ مومنین سے کہا کہ تم بنی اسرائیل کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے (حضرت) موسےٰ کو اس قدر تنگ کیا تھا۔ قرآنِ کریم کی اس آیت کی تفسیر میں بخاری شریف میں حسبِ ذیل روایت آئی ہے۔

ابوہریرہ رضؓ نبی صلعم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل برہنہ غسل کرتے تھے۔ ایک، دوسرے کی طرف دیکھتا جاتا تھا۔ اور موسےٰ علیہ السلام تنہا غسل کیا کرتے تھے ... تو

بنی اسرائیل نے کہا کہ واللہ موسےٰؑ کو ہم لوگوں کے ہمراہ غسل کرنے سے سوا اس کے کچھ مانع نہیں کہ وہ فتق میں مبتلا ہیں۔ اتفاق سے ایک دن موسےٰؑ غسل کرنے لگے اور اپنا لباس پتھر پر رکھ دیا۔ وہ پتھر ان کا لباس لے بھاگا اور حضرتِ موسےٰؑ بھی اس کے تعاقب میں، یہ کہتے ہوئے دوڑے کہ "ثوبی یا حجر، ثوبی یا حجر" اے پتھر! میرے کپڑے دے دے، اے پتھر! میرے کپڑے دیدے۔ یہانتک کہ بنی اسرائیل نے موسےٰؑ کی طرف دیکھ لیا اور کہا کہ موسےٰؑ کو کچھ بیماری نہیں ہے .... (اور پتھر ٹھہر گیا) موسےٰؑ نے اپنا لباس لے لیا اور پتھر کو مارنے لگے۔ ابوہریرہ رضؓ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم (حضرتِ موسیٰؑ کی مار سے) اس پر چھ یا سات نشان (اب تک باقی) ہیں۔

(بخاری جلد اول اردو ترجمہ صفحہ ۷۶)

۲- قرآنِ کریم میں اللہ تعالےٰ کے متعلق ہے۔ ھُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ۔ (۵۷/۳) یعنی خدا زمان (TIME) کی قیود سے ماوراء ہے۔ یہ ایسی صاف اور واضح بات ہے جس کے سمجھنے میں کسی قسم کی دشواری نہیں ——— وہی اول وہی آخر ہے ——— لیکن حدیث کی کتاب ترمذی میں حضرتِ عباس رضؓ کی ایک روایت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:-

> رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک اکہتر (۱) یا بہتر (۲) یا تہتر (۳) سال کی راہ ہے اور سات آسمان ہیں جن میں سے ہر ایک سے دوسرے کا فاصلہ اسی قدر ہے ——— ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کی گہرائی بھی اتنی ہی ہے۔ اس کے اوپر سات پہاڑی بکرے ہیں جن کے کھروں سے گھٹنوں تک اسی قدر فاصلہ ہے۔ ان بکروں کی پشت پر عرش ہے جس کی موٹائی اسی قدر ہے۔

غالباً قرآنِ کریم کی اس آیت کی بھی تفسیر ہے جس میں کہا گیا ہے کہ: کَانَ عَرْشُهٗ عَلَی الْمَآءِ (۱۱/۷) یہ آیت ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ قرآنِ مجید میں ہے۔ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ (۲۱/۳۰) "ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے بنایا" یعنی پانی مدارِ حیات ہے۔ اس کے بغیر زندگی کا امکان نہیں۔ اور عرش کے معنیٰ اقتدار کے ہیں۔ لہٰذا، آیت کا مطلب یہ ہوا کہ زندگی کی اساس و بنیاد پر خدا کا کنٹرول ہے۔ آپ آیت کے اس مفہوم کو دیکھئے اور اس کے بعد اس روایت کو جو اوپر درج کی گئی ہے اور پھر فیصلہ کیجئے کہ کیا اس تفسیر کو کسی صورت میں بھی نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے؛ لیکن جو ایسا کہے، اُسے منکرِ حدیث اور نہ جانے کیا کیا قرار دیا جاتا ہے۔

۳- ایک اور مثال ملاحظہ فرمایئے۔ سورۂ حجر میں ہے:-

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ۔ وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ۔ (۱۵/۲۴-۲۵)

اور ہم اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور پچھلوں کو بھی جانتے ہیں اور تیرا رب انہیں اکٹھا کرے گا۔ وہ حکمت والا علم والا ہے۔

اکٹھا کرنے کے ضمن میں دوسری جگہ کہا ہے :-

لَمَجْمُوعُونَ إِلَىٰ مِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ - (۵۶/۵۰)

یعنی پہلے اور پچھلے متعین دن کی میعاد پر جمع کئے جائیں گے۔

آیت کا مفہوم بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالٰے ان لوگوں کو جو پہلے ہو گزرے ہیں، اور انہیں جو آنے والے ہیں میدانِ حشر میں جمع کرے گا۔ اب یہ دیکھئے کہ روایات کی رُو سے ان آیات کی تفسیر کیا ہے۔ جامع ترمذی میں حضرت ابنِ عباس رضؓ کی روایت ہے کہ :-

ایک حسین ترین عورت مسجد میں رسول اللہ کے پیچھے نماز پڑھنے آیا کرتی تھی۔ صحابہ رضؓ میں سے کچھ لوگ تو آگے کی صف میں بڑھ جاتے تھے تاکہ اسے نہ دیکھیں۔ لیکن کچھ لوگ پیچھے کی صف میں شریک ہوتے تھے اور رکوع کی حالت میں بغل کے نیچے کی طرف سے اسے جھانکتے رہتے تھے اس پر اللہ تعالٰے نے یہ آیت اتاری کہ ہم تم میں سے اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور پچھلوں کو بھی۔

ہم اِن روایات پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ یہ جو کہا جاتا ہے قرآنِ کریم کی تفسیر صحیح ہے جو روایات میں بیان کی گئی ہے، آپ کو اندازہ ہو جائے کہ وہ تفسیر کس قسم کی ہے۔ آپ سوچئے کہ ان روایات کو کسی صورت میں بھی رسول اللہؐ کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ ان کتب احادیث کی روایات ہیں جنہیں مسلمہ طور پر صحیح تسلیم کیا جاتا ہے اور جن کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ انہیں بھی جبرائیلِ امین، قرآن کی طرح، خدا کی طرف سے لے کر نازل ہوتے تھے۔

اس مقام پر آپ کے دل میں یہ خیال ابھرتا ہوگا کہ اس قسم کی حدیثوں کو (جو اپنی زبان سے اعلان کر رہی ہیں کہ وہ وضعی ہیں۔ وہ حضورؐ کے ارشادات نہیں ہو سکتے) ان کتابوں میں کیوں رہنے دیا جا رہا ہے انہیں کیوں احادیثِ نبویؐ تسلیم کیا جاتا ہے؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور اس کی وجہ غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔

احادیث کو وحی قرار دینے والوں میں ایک گروہ (اہلِ حدیث کا) وہ ہے جس کا عقیدہ یہ ہے کہ (کم از کم) بخاریؒ اور مسلمؒ کی تمام حدیثیں صحیح ہیں اور ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی انسان کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ اس وقت ہم ان کے اس عقیدہ سے بحث نہیں کرنا چاہتے۔ کہنا صرف یہ چاہتے ہیں ان کے ہاں اس کی گنجائش نہیں کہ جس حدیث کو چاہے صحیح قرار دے دیں اور جسے چاہے غلط یا وضعی قرار دے کر اسے مسترد کر دیں۔ اصل یہ ہے کہ، صرف اہلِ حدیث ہی نہیں، باقی فرقوں کے ہاں بھی یہ عقیدہ ہے کہ احادیث کے مختلف مجموعوں میں جس قدر احادیث ہیں ان کی چھان پھٹک پہلے سے ہو چکی ہے اور ان میں مزید تنقید و تفحص کی گنجائش نہیں۔ ان مجموعوں میں جن احادیث کو صحیح قرار دیا جا چکا ہے وہ صحیح ہیں، جنہیں ضعیف قرار دیا گیا ہے، وہ ضعیف ہیں۔

لیکن مودودی صاحب کا مسلک ان سب سے الگ ہے۔ وہ احادیث کی اس تقسیم و تفریق کو، جو پہلے سے چلی آ رہی ہے، قابلِ قبول تسلیم نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ :-

اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو اس

کی نسبت کا صحیح و معتبر ہونا بجائے خود زیرِ بحث ہوتا ہے۔ آپ (یعنی منتقدینِ حدیث) کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیثِ رسول مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں۔ ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔ (رسائل و مسائل حصہ اوّل۔ ستمبر ۱۹۵۱ء ایڈیشن۔ صنہ ۲۹)

مزاجِ شناسِ رسول

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک، حدیث کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار کیا ہے۔ سنیئے اور غور سے سنیئے.... فرماتے ہیں :-

> جس شخص کو اللہ تعالیٰ تفقہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے اس کے اندر قرآن اور سیرتِ رسولؐ کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت، کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے...... جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہؐ کا مطالعہ کیا ہوتا ہے۔ وہ نبی اکرمؐ کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت اسے بتا دیتی ہے کہ ان میں سے کون سا قول یا کونسا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے۔ ...... یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔
>
> (تفہیمات۔ حصہ اول۔ صفحہ ۳۲۴ - ۳۲۳)

یعنی مودودی صاحب کے نزدیک، احادیث کے پرکھنے کا کوئی خارجی معیار نہیں۔ اس کا فیصلہ مزاج شناسِ رسولؐ کی نگاہِ بصیرت پر موقوف ہے۔ جسے وہ صحیح کہہ دے، وہ صحیح۔ جسے وہ غلط قرار دے دے، وہ غلط!.... مودودی صاحب کے متبعین انہیں امام مالکؒ۔ امام حنبلؒ اور امام ابن تیمیہؒ کا ہم پایہ، اللہ کا شاہکار اور دورِ حاضر کا عظیم ترین انسان قرار دیتے ہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ان کے سوا مزاج شناسِ رسولؐ کون ہو سکتا ہے؟ وہ مودودی صاحب کو مزاج شناسِ رسولؐ قرار دیتے ہیں۔

اس سے آپ دیکھ لیجئے کہ مودودی صاحب نے اپنے لئے کس قدر گنجائش پیدا کر لی — کہ جس حدیث کو وہ اپنے مفیدِ مطلب سمجھیں اسے قولِ رسول اللہؐ قرار دے کر، وحیِ خداوندی اور سند اور حجت قرار دے دیں۔ جسے اپنے مقصد کے خلاف سمجھیں اسے مسترد کر دیں۔ اس کے بعد دیکھئے کہ وہ اپنے اس مسلک سے کس قدر فائدہ اٹھاتے ہیں۔

انہوں نے جب جماعتِ اسلامی کی بنیاد رکھی تو ملک کے بعض اربابِ علم و فضل نے بھی اس میں شمولیت اختیار کر لی۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد انہوں نے اپنے مسلک میں تبدیلی کی۔ حصولِ اقتدار کو اپنا مقصود قرار دیا، اور جائز و ناجائز جو کچھ حصولِ اقتدار کے لئے کرنا پڑتا ہے، وہ کرنا شروع کر دیا۔ اس پر ان کی جماعت کے ممتاز ترین ارکان نے صدائے احتجاج بلند کی اور کہا کہ جماعت سازی کے زمانے میں آپ جو بلند و بالا اصول پیش کیا کرتے تھے، اب

آپ ان اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور کذب و افترا تک سے بھی گریز نہیں کرتے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ان اعتراضات کے جواب میں انہوں نے کیا کہا؟ انہوں نے کہا کہ اگر میں نے اصول شکنی کی ہے اور کذب و افترا سے کام لیا ہے، تو کونسا خلافِ اسلام کام کیا ہے۔ (معاذاللہ۔ صدبار معاذاللہ) خود رسول اللہؐ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ مثلاً:-

> اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرقِ مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔ اس چیز کو قرآن مجید میں بھی پیش کیا گیا اور حضورؐ نے بھی بار بار نہ صرف زبانِ مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے مناصب دے کر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی ؎ لیکن جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے ہدایت دی کہ: الائمۃ من قریش ۔ "امام قریش میں سے ہوں"۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص معاملہ میں یہ ہدایت، مساوات کے اس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ (رسائل و مسائل۔ حصہ چہارم۔ سستا ایڈیشن۔ صفحہ ۳۳۰-۳۲۹)

"الائمۃ من قریش" کی روایت کے وضعی ہونے کے لئے کسی لمبے چوڑے ثبوت کی ضرورت نہیں۔ (جیسا کہ خود مودودی صاحب نے اعتراف کیا ہے) یہ قرآنِ مجید کی اصولی تعلیم کے بھی خلاف ہے اور حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کے بھی خلاف۔ لیکن چونکہ مودودی صاحب کو اپنی اصول شکنی کو عین مطابقِ اسلام ثابت کرنے کے لئے سند درکار تھی، اس لئے وہ اس روایت کو بالکل صحیح قرار دیتے ہیں۔ اور اس کا ثبوت! "مزاج شناسِ رسول" کی نگاہِ بصیرت کا فیصلہ!!

اب ان کے رفقاء کے دوسرے اعتراض کی طرف آیئے۔ یعنی جھوٹ بولنے کے اعتراض کی طرف۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے فرمایا کہ:-

> راست بازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتوےٰ دے دیا گیا ہے۔

اور اس کے بعد (غیرتِ ناموسِ رسالتؐ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے) دھڑلے سے فرمایا کہ:-

> کعب بن اشرف کے قتل کے لئے محمد بن مسلمہ کو جب حضورؐ نے مامور کیا تو انہوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں؛ حضورؐ نے بالفاظِ صریح انہیں اس کی اجازت دی۔ (ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۸ء۔ صفحہ ۵۵-۵۴)

ان مثالوں سے آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ حضرات اس قسم کی روایات کو، جو بالبداہت وضعی ثابت ہوتی ہیں، مسترد کیوں نہیں کرتے! یہ روایات ان کی اصول شکنیوں اور دروغ بافیوں کو عین مطابقِ اسلام قرار

؎ یعنی حضورؐ نے مساوات قائم کر کے نہیں دکھائی۔ قائم کرنے کی کوشش فرمائی!

دینے کے لئے سند کا کام دیتی ہیں۔ میرا جرم یہ ہے کہ میں کہتا ہوں کہ کوئی روایت بھی ہو، اسے قرآن مجید کے معیار پر پرکھ لینا چاہیئے۔ اگر وہ اس کے مطابق ہو تو اسے صحیح تسلیم کر لینا چاہیئے۔ اگر اس کے خلاف جائے تو اسے مسترد کر دینا چاہیئے۔ چونکہ اس کے معیار کی رو سے ان حضرات کے لئے اصول شکنیوں اور کذب تراشیوں کی گنجائش نہیں رہتی اس لئے وہ ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں کہ یہ شخص منکرِ حدیث ہے۔ اس کی بات کوئی نہ سنے۔ اور اس ڈھنڈورے کو اس شد و مد سے پیٹتے ہیں کہ قرآنی معیار کی بات اس شور و شغب میں دب کر رہ جاتی ہے۔ باقی رہا یہ کہ اس سے حضور نبی اکرم کی سیرتِ طیبہ کس قدر داغدار ہو کر دنیا کے سامنے آتی ہے تو اس سے انہیں کیا غرض؟

بہرحال ہم کہہ یہ رہے تھے کہ قرآن کریم میں شکوک و شبہات پیدا کرنے اور اسے محرّف اور انسانی راہ نمائی کے لئے ناقص اور ناکافی قرار دینے کے لئے کیا کیا سازشیں ہوئی ہیں، اور ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

ہم نے اس وقت تک جو کچھ کہا ہے اس کا تعلق اربابِ شریعت سے ہے۔ یعنی راویانِ حدیث، جامعینِ حدیث محدثین، مفسرین اور فقہاء۔ ان کا تعلق شریعت سے ہے۔ دوسرا طبقہ اصحابِ طریقت یعنی صوفیاء کرام کا ہے۔ جنہیں اولیاء اللہ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی تشریح و تفسیر کے متعلق وہ، اربابِ شریعت سے کہیں آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کے متعلق، متعدد مقامات پر اور نہایت وضاحت سے بتایا کہ یہ لسانِ عربی مبین کی کتاب ہے۔ یعنی اسے نہایت واضح عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو کتاب عربی زبان میں نازل کی گئی ہو، وہ اس زبان کی رو ہی سے سمجھی جا سکتی ہے۔ لیکن اربابِ طریقت کا یہ ارشاد ہے کہ اس کتاب کے الفاظ

باطنی معانی

کے جو معانی ہیں، یہ ان کی رُو سے نہیں سمجھی جا سکتی۔ ہر لفظ کا ایک باطنی مفہوم ہے جو اس لفظ کے اندر چھپا ہوا ہے اور جو ظاہری علم کی رُو سے سمجھ میں نہیں آ سکتا اس کے لئے باطنی آنکھ کی ضرورت ہے۔ باطنی معانی کا عقیدہ یہودیوں نے وضع کیا تھا۔ یہودی تصوف کی سب سے اہم کتاب زھّاد میں ہے کہ:

> تورات کی روح درحقیقت اس کے باطنی معنوں میں پوشیدہ ہے۔ انسان ہر مقام پر خدا کا جلوہ دیکھ سکتا ہے، بشرطیکہ وہ تورات کے ان باطنی معانی کا راز پا جائے۔

ان باطنی معانی کے متعلق تاکید تھی کہ ان کا علم، خواص تک محدود رہے۔ عوام ان پر مطلع نہ ہونے پائیں۔ چنانچہ یہودیوں کی روایات کی کتاب مشنا میں لکھا ہے کہ:

> کتابِ پیدائش کے باطنی معانی کی تعلیم ایک وقت میں ایک سے زیادہ آدمیوں کو نہیں دینی چاہیئے اور کتاب حزاقیل کے پہلے باب کی تعلیم تو ایک آدمی کو بھی نہیں دینی چاہیئے تاوقتیکہ اس نے مقام ولایت حاصل نہ کر لیا ہو۔

ہمارے اربابِ تصوف نے یہ عقیدہ تو یہودیوں سے لیا لیکن اس کی سند کیلئے اس قسم کی حدیثیں وضع کر لیں کہ:

> حضرتِ ابوہریرہ رض نے فرمایا کہ مجھے رسول اللہ م سے علم کے دو برتن ملے۔ ایک (علم ظاہری) کو تو میں نے پھیلا دیا ہے لیکن اگر میں دوسرے (علم باطنی) کو ظاہر کر دوں تو میری رگِ حیات کاٹ دی

جائے۔ (بخاری باب العلم)

یہ باطنی معانی کس قسم کے ہوتے ہیں اس کی توضیح و تشریح کے لئے کئی صفحات درکار ہوں گے۔ ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔ شیخ اکبر محی الدین ابنِ عربی کو زمرۂ صوفیاء کا سرخیل قرار دیا جاتا ہے۔ وہ "وحدت الوجود" کے عقیدہ کے علمبردار ہیں۔ اس عقیدہ کا ملخص یہ ہے کہ انسان اور جملہ کائنات میں سے کوئی شے اپنا وجود نہیں رکھتی۔ یہ سب خدا ہی خدا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی مشہور کتاب فصوص الحکم میں لکھتے ہیں کہ:۔

> فرعون کو ایک طرح سے حق تھا کہ کہے۔ اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی ۔ کیونکہ وہ ذاتِ حق سے جدا نہ تھا اگرچہ اس کی صورت فرعون کی تھی۔ (معاذ اللہ)!

ان کے بیان کردہ باطنی معانی کی مثال دیکھئے۔ قرآنِ کریم میں ہے۔ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ۔ (۲۰/۵۵) اس کا صاف اور سیدھا ترجمہ یہ ہے کہ "ہم نے تمہیں اس زمین سے پیدا کیا۔ اسی میں تمہیں لوٹائیں گے اور اسی سے تمہیں بارِ دیگر نکالیں گے"۔ ابنِ عربی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:۔

> ہم سب احدیت سے نکلے تھے۔ فنا ہو کر پھر احدیت میں جا چھپیں گے۔ پھر بقا ملے گی اور پھر دوبارہ نمودار ہوں گے۔ (فصوص الحکم)

یعنی ان کے نزدیک ارض (زمین) کے باطنی معانی ذاتِ خداوندی ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ ان حضرات کے نزدیک قرآنِ کریم کے الفاظ کے باطنی معانی کس قسم کے ہوتے ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ انہیں ان معانی کا علم خدا کی طرف سے براہِ راست ملتا ہے۔ اسے وہ علمِ لدنی یا کشف و الہام کہہ کر پکارتے ہیں۔ باطنی معانی کی رو سے قرآنِ کریم کو کس طرح مسخ کر دیا جاتا ہے، اس کے متعلق علامہ اقبالؒ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستورالعمل و شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستورالعمل کو مسخ کر دینا ہے۔ یہ ایک نہایت لطیف (SUBTLE) طریق تنسیخ کا ہے اور یہ طریق وہی قومیں اختیار یا ایجاد کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعراء ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفہ کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلانِ طبیعت موجود تھا اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اس کا نشوونما نہ ہونے دیا، تاہم وقت پا کر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا یا بالفاظِ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بناء "وحدت الوجود" تھی۔ ان شعراء نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائرِ اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے۔ (اقبالؔ نامہ۔ جلد اوّل۔ ص ۳۵)

اور اسی بنا پر انہوں نے اپنے ایک اور مکتوب میں لکھا تھا:۔

> جہاں تک مجھے علم ہے، فصوص الحکم میں سوائے الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں۔ (ایضاً ص ۴۴)

یہ ہے جو — ارباب طریقت نے قرآنِ مجید کے ساتھ کیا۔

سورۂ توبہ میں ہے:-

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ - (9/34)

اے جماعتِ مومنین! یاد رکھو علماء اور مشائخ کی اکثریت ایسی ہے جو لوگوں کا مال ناجائز طریق پر کھا جاتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کی طرف لے جانے والے راستے میں، روک بن کر کھڑے ہوتے ہیں۔

جیسا کہ ہم شروع میں لکھ چکے ہیں، قرآن کریم نے (سورۂ فاتحہ کے بعد) پہلی سورت کی پہلی آیت میں (الم کے بعد) کہا ہے کہ: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ - هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ - یعنی یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کے شبہ اور ریب و تشکیک کا شائبہ تک نہیں اور یہ سفرِ حیات میں ان لوگوں کی راہ نمائی کرتی ہے جو بلا خوف و خطر اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنا چاہیں۔ اس آیۂ جلیلہ سے یہ واضح ہے کہ قرآنِ کریم اسی صورت میں کتابِ ہدایت بن سکتی ہے جب اس کے متعلق یقین کامل ہو کہ اس کا ایک ایک لفظ منزل من اللہ ہے اور جس شکل میں وہ آج ہمارے پاس موجود ہے، رسول اللہؐ نے اسے اسی شکل میں اُمت کو دیا تھا۔ اس میں کسی لفظ کا تو ایک طرف، نقطے اور اعراب تک میں، کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا اور نہ قیامت تک ایسا ہو سکتا ہے، کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے۔ اگر اس حقیقت میں ذرا سا بھی شک پیدا ہو جائے تو قرآن مجید سے ہدایت نہیں مل سکتی۔

اس حقیقت کو سامنے رکھئے اور پھر دیکھئے کہ اس کتاب میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کے لئے کیسی منظّم سازش کی گئی ہے۔ جو کچھ ہم نے اس باب میں لکھا ہے، آپ علماء حضرات میں سے کسی سے پوچھ لیجئے کہ سند کے اعتبار سے اس میں کسی قسم کی غلطی ہے؟ اس سازش کی ٹیکنیک یہ ہے کہ جو کچھ اس باب میں کیا یا کہا گیا' اسے منسوب کر دیا اس ذاتِ گرامیؐ کی طرف، جو رسولِ امینؐ تھے اور جنہوں نے منزل من اللہ وحی کا ایک ایک لفظ کامل امانت اور دیانت کے ساتھ، نوعِ انسان تک پہنچا دیا۔ اس سے واضح ہے کہ جو کچھ اس ضمن میں حضورؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ سب وضعی ہے اور اُس سازش کا نتیجہ جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے۔

میری عمر کا حصۂ اوّل شریعت اور طریقت کی انہی وادیوں میں گزرا ہے۔ اس لئے میں اس موضوع کے متعلق جو کچھ کہتا ہوں وہ شنید نہیں، دید ہے۔ اور اسی لئے میں جو کچھ کہتا ہوں سند کے ساتھ کہتا ہوں۔ ان وادیوں سے نکلنے کے بعد، مبداءِ فیض کی کرم گستری سے مجھے قرآنِ کریم کے سمجھنے کی توفیق عطا ہوئی اور اسی سے مجھ پر یہ حقیقت واشگاف ہوئی کہ ــــــــ خدا کی طرف لے جانے والے راستے میں احبار و رہبان (علماء اور مشائخ) کس طرح روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں؟

احبار و رہبان

غور کیجئے کہ یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ عوام یہ سمجھتے ہیں کہ یہ حضرات، خدا کی طرف لے جانے والے راستہ کی طرف راہ نمائی کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کہتا ہے کہ یہ اس راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں نے قرآنِ کریم سے جو بصیرت حاصل کی، اس سے میں نے اپنا یہ فریضہ سمجھا کہ قرآنِ کریم کو اُمت کی نگاہوں سے اوجھل کرنے کے لئے جو جو پردے لٹکائے گئے ہیں، میں انہیں ہٹانے کی امکان بھر کوشش کروں۔ ظاہر ہے کہ احبار و رہبان پر اس قسم کی کوشش بڑی ناگوار گزرتی ہے اور ان کی طرف سے اس کی مخالفت بالکل فطری امر ہے۔ بایں ہمہ، ان میں ایسے

خوش بخت حضرات بھی ہو گزرے ہیں جنہیں اس کا احساس ہوا اور انہوں نے اپنی عمرِ گذشتہ کے ضائع ہو جانے پر بڑے تاسف کا اظہار کیا۔ مولانا سید محمد انور شاہ (مرحوم) علماء دیوبند میں بلند ترین مقام رکھتے تھے۔ ان کی آخری زندگی کا ایک عبرت آموز واقعہ، مفتی محمد شفیع (مرحوم) کی زبانی ماہنامہ میثاق کی نومبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ وہ اس قابل ہے کہ اس پر انتہائی تدبر سے غور و فکر کیا جائے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"ایک اہم واقعہ بھی آپ کے گوش گذار کروں جو اہم بھی ہے اور عبرت خیز بھی۔ قادیان میں ہر سال ہمارا جلسہ ہوا کرتا تھا، اور سیدی حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ ایک سال اسی جلسہ پر تشریف لائے، میں بھی آپ کے ساتھ تھا۔ ایک صبح نمازِ فجر کے وقت اندھیرے میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت سر پکڑے ہوئے بہت مغموم بیٹھے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ "حضرت کیسا مزاج ہے؟"

کہا۔ "ہاں! ٹھیک ہی ہے میاں، مزاج کیا پوچھتے ہو، عمر ضائع کر دی!"

میں نے عرض کیا۔ "حضرت! آپ کی ساری عمر علم کی خدمت میں، دین کی اشاعت میں گذری ہے۔ ہزاروں آپ کے شاگرد علماء ہیں، مشاہیر ہیں جو آپ سے مستفید ہوئے اور خدمتِ دین میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ کی عمر اگر ضائع ہوئی تو پھر کس کی عمر کام میں لگی!"

فرمایا۔ "میں تمہیں صحیح کہتا ہوں، عمر ضائع کر دی!"

میں نے عرض کیا۔ "حضرت بات کیا ہے؟"

فرمایا۔ "ہماری عمر کا، ہماری تقریروں کا، ہماری ساری کد و کاوش کا، خلاصہ یہ رہا ہے کہ دوسرے مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح قائم کر دیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے مسائل کے دلائل تلاش کریں اور دوسرے ائمہ کے مسائل پر آپ کے مسلک کی ترجیح ثابت کریں۔ یہ رہا ہے محور ہماری کوششوں کا، تقریروں کا اور علمی زندگی کا۔"

"اب غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کس چیز میں عمر برباد کی؟ ابوحنیفہؒ ہماری ترجیح کے محتاج ہیں کہ ہم ان پر کوئی احسان کریں؟ ان کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام دیا ہے وہ لوگوں سے خود اپنا لوہا منوائے گا، وہ تو ہمارے محتاج نہیں اور امام شافعیؒ، مالکؒ اور احمد بن حنبلؒ اور دوسرے مسالک کے فقہا جن کے مقابلے میں ہم یہ ترجیح قائم کرتے آئے ہیں، کیا حاصل ہے، اس کا؟ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو "صواب محتمل الخطا" (درست مسلک جس میں خطا کا احتمال موجود ہے) ثابت کر دیں اور دوسرے کے مسلک کو "خطاء محتمل الصواب" (غلط مسلک جس کے حق ہونے کا احتمال موجود ہے) کہیں۔ اس سے آگے کوئی نتیجہ نہیں، ان تمام بحثوں، تدقیقات اور تحقیقات کا جن میں ہم مصروف ہیں۔"

پھر فرمایا:-

"ارے میاں! اس کا تو کہیں حشر میں بھی راز نہیں کھلے گا کہ کونسا مسلک صواب تھا، اور کونسا خطاء...

اجتہادی مسائل صرف یہی نہیں کہ دنیا میں ان کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں بھی ہم تمام تر تحقیق و کاوش کے بعد یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی صحیح اور وہ بھی صحیح۔ یا یہ کہ یہ صحیح ہے لیکن احتمال موجود ہے کہ یہ خطا ہو اور وہ خطا ہے اس احتمال کے ساتھ کہ صواب ہو، دنیا میں تو یہ ہے ہی، قبر میں بھی منکر نکیر نہیں پوچھیں گے کہ رفع یدین حق تھا یا

ترکِ رفع یدین حق تھا ؛ آمین بالجہر حق یا بالسّر حق تھی۔ برزخ میں بھی اس کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا اور قبر میں بھی یہ سوال نہیں ہوگا۔"

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ یہ تھے :۔

"اللہ تعالےٰ شافعیؒ کو رسوا کرے گا، نہ ابوحنیفہؒ کو، نہ مالکؒ کو، نہ احمد بن حنبلؒ کو، جن کو اللہ تعالےٰ نے اپنے دین کے علم کا انعام دیا ہے، جن کے ساتھ اپنی مخلوق کے بہت بڑے حصّے کو لگا دیا ہے، جنہوں نے نورِ ہدایت چار سو پھیلایا ہے، جن کی زندگیاں سُنّت کا نور پھیلانے میں گذریں۔ اللہ تعالےٰ ان میں سے کسی کو رسوا نہیں کرے گا کہ وہاں میدانِ حشر میں کھڑا کرکے یہ معلوم کرے کہ ابوحنیفہؒ نے صحیح کہا تھا یا شافعیؒ نے غلط کہا تھا۔ یا اس کے برعکس؛ یہ نہیں ہوگا۔

تو جس چیز کو نہ دنیا میں کہیں نکھرنا ہے نہ برزخ میں نہ محشر میں، اسی کے پیچھے پڑ کر ہم نے اپنی عمر ضائع کر دی، اپنی قوت صرف کر دی، اور جو صحیح اسلام کی دعوت تھی، مجمع علیہ اور سبھی کے مابین جو مسائل متفقہ تھے اور دین کی جو ضروریات سبھی کے نزدیک اہم تھیں، جن کی دعوت انبیاء کرامؑ لے کر آئے تھے، جن کی دعوت کو عام کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا تھا اور وہ منکرات جن کو مٹانے کی کوشش ہم پر فرض کی گئی تھی۔۔۔ آج یہ دعوت تو نہیں دی جا رہی۔ یہ ضروریاتِ دین تو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو رہی ہیں اور اپنے و اغیار اُن کے چہرے کو مسخ کر رہے ہیں، اور وہ منکرات جن کو مٹانے میں ہمیں لگے ہونا چاہیئے تھا وہ پھیل رہے ہیں، گمراہی پھیل رہی ہے، الحاد آ رہا ہے، شرک و بت پرستی چل رہی ہے، حرام و حلال کا امتیاز اُٹھ رہا ہے، لیکن ہم لگے ہوئے ہیں، ان فرعی و فروعی بحثوں میں !"

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا :۔

"یوں غمگین بیٹھا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ عمر ضائع کر دی۔"

شیخ الہند مولانا محمود الحسن (مرحوم) کا مقامِ بلند بھی کسی کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ اسی ماہنامہ کے صفحہ ۴۸ پر مفتی محمد شفیع (مرحوم) ہی کے حوالے سے، ان کا ایک واقعہ درج ہے جو اسی طرح غور و فکر کا متقاضی ہے شیخ الہند (مرحوم) نے فرمایا :۔

> مَیں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن چھوڑ دینا، دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی، اس لئے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآنِ کریم کو لفظاً و معناً عام کیا جائے۔ بچوں کے لئے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی بستی میں قائم کئے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درس قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لئے آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔

میں نے اپنی زندگی کا یہی مقصد قرار دے رکھا ہے اور گذشتہ چالیس سال سے قرآنِ کریم کی تعلیم اور پیغام کے عام

کرنے میں مصروفِ جد و جہد ہوں۔ اس جد و جہد کا ماحصل یہ ہے:۔

۱۔ جو شخص قرآنِ کریم کو من جانب اللہ سمجھتا ہے اس کے لئے یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں کہ جو قرآن اُمت میں متواتر چلا آرہا ہے وہ حرفاً حرفاً وہی ہے جیسے خدا نے حضور نبی اکرمؐ پر وحی فرمایا اور جسے حضورؐ نے اُمت کو دیا۔ اس لئے کہ جس شخص کا ایمان ہو کہ قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے اسے اس حقیقت میں ذرا سا بھی شک و شبہ لاحق نہیں ہو سکتا۔ لیکن چونکہ اس باب میں شکوک و شبہات کے طومار کھڑے کر دئیے گئے ہیں، اس لئے میں نے سب سے پہلے اس حقیقت کو واشگاف کیا کہ قرآنِ کریم خود نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ میں اسی شکل میں مرتب اور مدون ہو چکا تھا جس شکل میں وہ اُمت کے پاس متواتر چلا آرہا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل، میری کتاب "آسمانی کتابوں کی کہانی" کے آخری باب میں ملے گی۔

۲۔ ارشادِ باری تعالےٰ ہے کہ اس نے قرآنِ مجید کو لسانِ عربی مبین میں نازل کیا ہے۔ بنا بریں قرآنِ کریم کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ زمانہ نزولِ قرآن میں، عرب، قرآنی الفاظ کا مفہوم کیا سمجھتے تھے؟ اس مقصد کے لئے میں نے پورے قرآنِ مجید کا ایک ضخیم لغت مرتب کیا جو لغات القرآن کے نام سے چار جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔

۳۔ قرآنِ کریم نے یہ بھی کہا ہے کہ اس نے اپنا مطلب "تصریفِ آیات" کی رُو سے واضح کیا ہے۔ یعنی اس سے ایک موضوع کو مختلف مقامات پر بیان کیا ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر، ضروری ہے کہ ہمیں معلوم ہو کہ فلاں مسئلہ، حکم، موضوع کے متعلق قرآنِ مجید کے کس کس مقام پر کیا آیا ہے۔ اس سے قرآنی اصطلاحات کا مفہوم بھی متعین ہو جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے میں نے "تبویب القرآن" کے نام سے ایک ضخیم کتاب مرتب کی ہے۔ یہ کتاب قریب ڈیڑھ ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ اور تین جلدوں میں حال میں شائع ہوئی ہے۔

۴۔ لغات القرآن اور تصریفِ آیات کی روشنی میں، میں نے پورے قرآنِ مجید کا مفہوم مرتب کیا جو مفہوم القرآن کے نام سے تیس پاروں میں شائع ہو چکا ہے۔

۵۔ اسی طریق کے مطابق میں مختلف عنوانات سے، قرآنِ کریم کی تعلیم کو نہایت شرح و بسط سے پیش کرتا چلا ہوں۔ میری متعدد تصانیف ــــــ مثلاً۔ ابلیس و آدم۔ جوئے نور۔ برقِ طور۔ شعلۂ مستور۔ انسانیت۔ جہانِ فردا۔ کتاب التقدیر وغیرہ اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ ان کے بعد میں نے قرآن مسلسل تفسیر کا سلسلہ شروع کیا ہے جس کی دو جلدیں "مطالب الفرقان" کے نام سے شائع ہو چکی ہیں تیسری جلد زیرِ تسوید ہے۔ ان تصانیف سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآنِ کریم اپنے مفہوم کو بیان کرنے، مطالب کو سمجھانے کے لئے خارجی سہاروں کا محتاج نہیں۔

میری ان تمام کاوشوں کا منتہیٰ و مقصود اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں اس حقیقت کو عام کردوں کہ:۔

۱۔ قرآنِ کریم تمام نوعِ انسان کے لئے مکمل اور واحد ضابطۂ حیات ہے اور اسلامی مملکت کا آئین و دستور۔

۲- دنیا میں حق و باطل کا معیار۔ غلط اور صحیح کی میزان۔ خیر اور شر کے پرکھنے کی محک ہر دعویٰ کی صداقت کی سند، خدا کی کتاب ہے۔ حدیث بھی وہی صحیح ہے جو اس کتاب کے مطابق ہو اور تفسیر بھی وہی قابلِ قبول جو اس کے خلاف نہ جائے۔

۳- خدا کی طرف سے عطا کردہ آخری وحی بہ تمام و کمال اس کے اندر موجود ہے۔ اس سے باہر وحی کا وجود نہیں۔ یہ اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔ اور اس کے کوئی باطنی معانی نہیں۔

۴- یہ کتابِ عظیم شک و شبہ سے بالا ہے اور انسانی راہ نمائی کے لئے کافی اور خود مکتفی۔

یہ میری زندگی کا مقصد اور میری کاوشوں کا منتہیٰ۔ ظاہر ہے کہ مفاد پرست گروہوں کی طرف سے میری ان کوششوں کی مخالفت ہوگی اور سخت مخالفت۔ چنانچہ' یہ مخالفت جاری ہے اور شدت سے جاری۔ لیکن میری مخالفت میں جس قدر سنگ باری مجھ پر کی جاتی ہے میں اسے نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کئے چلا آ رہا ہوں۔ البتہ اس کا مجھے افسوس ضرور ہے کہ یہ حضرات اپنی اس مخالفت میں دیانت اور صداقت سے کام نہیں لیتے ـــــــ کذب و افترا کا شیوہ اختیار کرتے ہیں اور ہر قسم کے جھوٹے الزامات مجھ پر عائد کرتے ہیں۔ (یہ شخص منکرِ حدیث اور منکرِ رسالت ہے۔ تین نمازوں اور نو روزوں کا قائل ہے۔ ایک نیا مذہب ایجاد کر رہا ہے۔ یہ آخرالامر نبوت کا دعویٰ کرے گا ـــــــ یہ اور اس قسم کے غلط اور بے بنیاد الزامات و اتہامات' جن میں ذرا بھی حقیقت نہیں، میرے خلاف عائد کرتے رہتے ہیں۔

میرا ایمان یہ ہے کہ خدا کی یہ کتابِ عظیم (قرآنِ مجید) تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک واحد اور مکمل ضابطۂ ہدایت ہے۔ اور رسالتِ محمدیہؐ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آئینۂ صداقت۔ اسوۂ رسولؐ اللہ، شرف و مجدِ انسانیت کے لئے معیارِ کبریٰ ہے۔ اور جو نظام محمدؐ رسول اللہ و الّذین معہٗ کے مقدس ہاتھوں سے قائم ہوا تھا، وہی انسانیت کی نجات و سعادت کا ضامن ہے۔ اس نظام کی بنیاد قرآنِ مجید پر تھی۔

میرا اس حقیقت پر بھی ایمان ہے کہ مسلمان ہی نہیں بلکہ پوری کی پوری نوعِ انسانی، اسی نظام کی رُو سے عالم گیر اُمّت بن سکے گی۔ کیونکہ قرآنِ کریم کا یہ دعوےٰ ہے، جو ایک دن حقیقت بن کر سامنے آئے گا۔

قرآنِ کریم سے میں یہی سمجھا ہوں اور اسی کا عام کرنا میرا فریضۂ حیات ہے ـــــــ وہ دن نوعِ انسان کی عالم گیر سعادت کا دن ہوگا جب یہ حقیقت آشکارا ہوگی کہ:۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيهِ۔